ما بدولت

(آپ بیتی)

شوکت تھانوی

مایہ دولت

شوکت تھانوی

ادارہ فروغِ اردو دہلی

قیمت تین روپے چار آنے

(مطبوعہ جید پریس بلیماران دہلی)

کچا چٹھا

نہ میں مہاتما گاندھی ہوں، اور نہ مجھے "تلاش حق" نے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رخ کو اس قدر سچائی کے ساتھ پیش کروں کہ وہی سچ میری شامت بن کر میرے سامنے آ جائے۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ میں نے سچ بولنے کی نہایت خطرناک کوشش کی ہے اور دراصل اپنے ان حالات کو پیش کرنا ہی ایک قسم کا اقدام خودکشی ہے۔ مہاتما گاندھی کا کیا ہے۔ وہ تو بچپن سے مہاتما چلے آ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑا جرم انھوں نے یہ کیا ہے کہ گوشت کھا لیا یا کسی دوست کے بہکانے سے کسی بیسوا کے یہاں چلے گئے۔ اور وہاں سے صاف نکل آئے، لیکن یہ خاکسار نہ تو کبھی مہاتما تھا۔ نہ اب ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے جو دوسرے مہاتما گاندھی کی طرح اپنے حالاتِ زندگی برہمچاریہ ہو جانے کے بعد بھی نہیں بلکہ اس اصول کے خلاف کی عین حالت میں لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں، طرح طرح کے اندیشے سامنے ہیں۔ دوست خفا ہو جائیں گے۔ لوگ پست رائے قائم کر لیں گے۔ بزرگ نالائق سمجھنے لگیں گے۔ اور سب سے بڑھ کر بیوی ...... ذرا ٹھہر جائیے مجھے اس تصور سے پھر اختلاج ہونے لگا۔ بات یہ ہے کہ بیوی لاکھ ہمدم و ہمراز سہی مگر عقلمند آدمی

ہر بات تو بیوی سے کہا نہیں کرتے اور نہ دراصل بیوی سے ہر بات کہنے کے بعد ایک شوہر کو وہ عافیت حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی تاریکیوں پر روشنی نہ ڈالنے کی صورت ہیں، حاصل رہتی ہے۔ بیوی کو ہماری جتنی خامیوں کا علم ہے وہی کیا کم ہے کہ اب ہم اس موت کو اور بھی قریب کرنے کے لئے مارے شیخی کے اپنے کو بالکل بے نقاب بنا کر ان کے سامنے پیش کر دیں، مگر جب کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ بھی ایک قسم کا اقدام خودکشی ہے۔ میں پوری کوشش یہی کروں گا کہ جہاں تک ہو سکے سچ بولوں، البتہ شبہ اس سلسلہ میں یوں ہے کہ اگر مہاتما گاندھی کی طرح میری زندگی بھی معصوم ہوتی تو میں جھوٹ موٹ بھی جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرتا۔ مگر یہاں تو سوائے جرائم کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ طرح طرح کی بداعمالیوں بے عنوانیوں اور اخلاق سوزیوں کے سوا اور اس ہیچمدان کی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ مگر جو چیز ہم سے یہ حالات لکھوا رہی ہے اس کا نام ہے "خوف خدا"، اپنی زندگی پر جب کبھی خود اپنی نظر پڑ جاتی ہے اور سنجیدگی سے غور کرنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو گھنٹوں غور کیا کرتے ہیں کہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ہم سے وہ سب کچھ کیوں کر دہرایا جائے گا جو ہم کر چکے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ خود ہی اقبالی مجرم بن جائیں۔ کیا عجب کہ یہی اعتراف رحمت کو جوش میں لے آئے وہاں تو خیر رحمت پر بھروسہ ہے مگر گھر میں کیا ہوگا۔ بیگم صاحبہ کے سلسلہ میں تو رحمت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ عفو کا کوئی امکان ہی نہیں۔ یوں ہی اپنے شوہر سے بہت زیادہ خوش عقیدہ ہیں اور اب تو وہ غالباً اس خاکسار کو اس قابل سمجھنے لگیں گی کہ پولس کے حوالے کر دیں یا گھر سے نکال دیں یا کم سے کم ہمیشہ کے لئے سچ بولنے کی اس پاداش

میں قابل اعتبار سمجھنے لگیں۔

سچ بولنا دنیا میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے، مصیبت میں آپ ان ہی کو مبتلا پائیں گے جو سچ بولنے والے گزرے ہیں۔ قانون ان ہی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے، جھوٹ بولتے رہیئے، دھوکے دیتے رہیئے، بے ایمانیاں کیئے جائیے۔ مگر سب کو مطمئن رکھئے۔ کہ آپ نے یہ کچھ نہیں کیا ہے۔ سب مطمئن رہیں گے۔ زندگی بھر کی ایمانداری کے بعد ایک بے ایمانی کر لیجئے مقدمہ چل جائے گا۔ سزا ہو جائے گی چور چوری کر کے بھاگ جاتا ہے اور شاہ بنا پھرتا ہے۔ ساہوکار کے حساب میں ذرا سی غلطی ہو جاتی ہے۔ خیانت میں پکڑا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر دنیا کے اصول کو دیکھا جائے تو اس سے بڑھ کر اور حماقت کیا ہو سکتی ہے۔ کہ ہم اپنی کمزوریوں کو پیش کر دیں۔ اب یہ کہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا۔ کہ خدا نے اس کو سچ بولنے کی توفیق عطا کی۔

کوئی کہے گا ” سن لیا آپ نے یہ جو آپ کے شوکت تھانوی ہیں، اعلےٰ درجہ کے جواری واقع ہوئے ہیں “

کسی طرف سے آواز بلند ہوگی ” بدمعاشیوں کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں “

کوئی صاحب فرمائیں گے ” بے حیائی اور ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ کس صفائی سے اپنا اعمالنامہ پیش کیا ہے “

کوئی بڑے شاعرانہ انداز سے کہے گا، ” چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد “

اور بیوی اپنے پھولے ہوئے رخ روشن پر اپنے آنسوؤں کا انتظار کرنے

ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہیں گی "داری قسمت شکر ہے خداوند تیرا" یہ سب سچ بولنے کے سلسلہ میں ہوگا۔ سچ بولنے کی کوشش نہ کرتے تو کیسے اچھے رہتے لکھنے والے نہایت ادب سے "مولانا شوکت تھانوی" لکھ رہے تھے حالانکہ مولانا نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ زندگی میں دس پانچ ہی سالم روزے رکھے ہوں گے چہرے پر سوائے ایک سال کے کبھی داڑھی نہیں رہی۔ اور نہ سنجیدگی سے کبھی کوئی کام ایسا کیا جو خالص خدا کے لئے کہا جا سکے۔ لوگ حضرت شوکت تھانوی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کو معلوم نہیں ہے کہ یہ شوکت تھانوی بڑے حضرت ہیں۔ بیوی بہت زیادہ تو خیر خوش نہیں ہیں۔ اس لئے جو کچھ ان کے علم میں ہے۔ اسی کو وہ بدنصیبی کے لئے کافی سمجھتی ہیں۔ مگر ان کا شوہر یہ سچ نہ بولتا تو وہ اپنے کو اتنا ہی بدنصیب سمجھتی رہتیں اور اب تو ان بیچاری کی بدبختیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہے گا۔ اس لئے کہ ان کے شوہر میں اور تو سب عیب تھے ہی یہ کمبخت تو چور کے علاوہ سینہ زور بھی نکلا۔ بے شرمی کی حد کر دی سب کچھ لکھ کر چھاپ دیا کہ لو بیوی جلتی ہو تو جی کھول کر جلو تم ہمارا کر ہی کیا سکتی ہو، ہم نے جو کچھ کیا خوب ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ یہ کیا یہ کیا اور یہ کیا۔

ان تمام حالات کے ماتحت سچ بولنے کی جرأت کرنا خودکشی نہیں تو اور کیا ہے۔ گاندھی جی کو تلاشِ حق تھی اور یہاں تلاشِ شامت ہے۔ ان کا کیا ہے۔ وہ تو جہاں تھے اپنے حالات لکھ کر اس سے بھی کچھ اونچے ہو گئے مگر ہم دنیا کی نظروں سے اپنے کو گرانے کے لئے اپنے عقیدتمندوں میں بدعقیدگی پھیلانے کے لئے دوستوں سے دشمنی مول لینے کے لئے اور دشمنوں کی دشمنی مستحکم بنانے کے لئے یہ تمام

سامان کر رہے ہیں اپنے عزیز شرمائیں گے کہ لاحول ولا قوۃ اس ننگِ خاندان نے تو ناک ہی کاٹ لی۔ احباب پچھتائیں گے کہ توبہ ہے اس کمبخت سے کیوں میل جول رکھا۔ ہمارے لٹریچر سے دلچسپی رکھنے والے بددل ہوں گے کہ یہ تو بڑا تھرڈ کلاس انسان ثابت ہوا۔

یہ سب کچھ گوارا ہے۔ مگر اب زندگی کا اعتبار روز بروز اٹھتا جاتا ہے کنپٹی کے اوپر اور ناک کے عین نیچے کچھ بال سفید ہو چکے ہیں۔ قلب کی شکایت روز روز افزوں ترقی پر ہے۔ عینک کا نمبر بڑھتا جاتا ہے۔ یہ سب آثار ہیں وہاں پہنچنے کے۔ اور حال یہ ہے اب تک کہ دنیا کسی طرح چھوڑتی ہی نہیں۔ نہ روزے کے، نہ نماز کے، سوائے مصیبت کے کسی وقت خدا کا نام بھی زبان پر نہیں آتا۔ اب اگر خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ کم سے کم اپنی لغزشوں کا اعتراف ہی کر لیں تو اس توفیق سے دنیا والوں کے ڈر کے مارے ہم آخر کیوں باز رہ جائیں۔ ہم اگر سچ بولنے کے بعد قابلِ نفرت ثابت ہوتے ہیں۔ تو یہ قصور ہمارا نہیں بلکہ اس سچ کا ہوگا جس سے اب تک بچنے کی ہم نے ایمانداری کے ساتھ پوری کوشش کی مگر آخر کار ۔

دھرے گئے دلِ خانہ خراب کے بدلے

ہماری آپ بیتی کا یہ پہلا حصہ ہے جو اپنی زندگی کے اس دور پر ختم ہو جاتا ہے جس کا تعلق اخبار نویسی سے رہا۔ شروع شروع میں خیال یہ تھا کہ شاید خدا نے ہمارا رزق قلم ہی کے بہانے اتارا ہے۔ اور زندگی بھر ہم کو کاغذ ہی پر روٹی ملے گی... گزشتہ ۱۹۳۰ء کے وسط میں زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ اور اب گانے بجانے سے روٹی ملنے لگی۔ ریڈیو کی ملازمت کی پنچولی آرٹ پکچرز میں گئے۔ سونگ پبلسٹی میں آئے

مگر ابھی چونکہ یہ دور ناتمام ہے اور معلوم نہیں ابھی قسمت میں اور کیا کیا لکھا ہے۔ لہذا ہم اپنی رام کہانی اخبار نویسی کے دور کے اختتام تک فی الحال پیش کر رہے ہیں "مابدولت" کے بعد دوسرا حصہ ایں جانب ابھی پیش ہونے والی چیز نہیں بلکہ اس کو ہم برابر مرتب کرتے رہیں گے۔ اور غالباً وہ اس وقت پیش ہو سکے گی۔ جب پیش کرنے والا دنیا کی جوابدہی کے بجائے کسی اور جوابدہی میں مبتلا ہوگا۔

اس کے بعد میں نے کوشش کی ہے کہ تمام چھوٹے موٹے واقعات سامنے آجائیں۔ چھپانے اور دبانے کی کوشش محض ان واقعات کے سلسلے میں کی گئی ہے جن سے ہمارے علاوہ کسی اور کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ہم نے تو خیر اوکھلی میں سر ڈال ہی دیا ہے۔ مگر گیہوں کے ساتھ گھن کیوں پسیں۔ لہذا اس قسم کے واقعات اگر بیان بھی کئے ہیں تو فریق ثانی کا نام لئے بغیر ظاہر کئے ہیں۔ اس لئے کہ روشنی میں ہم خود آنا چاہتے ہیں کسی اور کی لغزشوں پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہم سے کوئی شکایت پیدا ہو تو ہم نہایت شرافت کے ساتھ معذرت خواہ ہونے کی پوری کوشش کریں گے۔

ادارہ فروغ اردو لاہور کے مالک محمد طفیل صاحب اس وقت بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ آپ کا اس خاکسار کے متعلق جو کچھ بھی خیال ہے اس کو تو آپ ہی جانتے ہوں گے۔ مگر اب اس نیاز مند سے کام لیتے ہیں ٹائپ رائٹر کا اور خیال آپ کا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے آکر محض آپ کا یہ کہہ کر بیٹھ جانا ہی کافی ہوتا ہے کہ اے ٹائپ رائٹر لکھ دے ایک کتاب جلدی سے چنانچہ آپ بیٹھے رہتے ہیں اور ٹائپ رائٹر لکھتا رہتا ہے۔ یہ کتاب بھی آپ نے اس ٹائپ رائٹر سے لکھوائی

ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے متعلق ہمارے ذہن میں کچھ نوٹ پہلے سے تیار تھے مگر ان کو تحریری شکل میں ترتیب کے ساتھ لانا اور وہ بھی اس صورت میں پاسبانِ عقل کسی وقت بھی دل کو تنہا نہ چھوڑے ایک عجیب قسم کی سزا ہے۔ گرمیوں میں کوئی تحریری کام کرنا یوں بھی بدمذاقی کی دلیل ہے۔ مگر ہم نے بھی اسی زمانہ میں یہ حالات اسی وجہ سے قلمبند کر دیئے کہ گرمیوں میں کسی خوش مذاقی کا بھی امکان مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے

اب معلوم نہیں طفیل صاحب اس کتاب کے ساتھ کیا سلوک کریں گے مگر استدعا ہم ان سے یہی کر رہے ہیں کہ ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اٹھے

لکھنؤ ۲۸ جون ۱۹۵۵ء

شوکت تھانوی

پیدائش وغیرہ

کتنی سچی بات کہی ہے جس کسی نے بھی کہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور دنیا کے ہر گوشہ میں ایک قطب اور ایک احمق ساتھ ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے یہاں تک کہ ہر ملک میں ایک قطب اور احمق ہوتا ہے۔ یعنی اس پایہ کا قطب جس کی قطبیت کو تمام ملک تسلیم کرلے۔ اور احمق بھی اس پایہ کا جس کی حماقت کے سامنے تمام ملک کے احمق سر تسلیم خم کر دیں۔ اسی طرح ہر صوبہ کا ایک قطب ہوتا ہے اور ایک احمق۔ پھر ہر شہر کا ایک قطب اور ایک احمق یہاں تک کہ ہر محلہ کا ایک قطب اور ایک احمق، اور اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں ایک بھائی قطب ہوتا ہے تو دوسرا احمق۔ دونوں اپنی اپنی جگہ مسلّم ہوتے ہیں، اور دونوں کا حلقۂ اثر جداگانہ ہوتا ہے۔

اب ذرا اس کلیہ کی صداقت ملاحظہ ہو کہ کہاں کرشن مراری اور کہاں ایک ادبی مداری، زمانہ ایک نہ سہی مگر مقام ایک ہی ہے۔ کرشن کا استھان بندرابن

ضلع متھرا جنم بھومی بنتا ہے کس کی ! .... شوکت تھانوی کی ... یہ ایک تاریخی لطیفہ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا واقعہ ہے، بندرا بن کے کوتوال صاحب منشی صدیق احمد صاحب مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی۔ اب اولاد کی تمنا تو پوری ہو گئی۔ مگر ہمارے بزرگ لڑکی کو نصف اولاد سمجھا کرتے تھے۔ جس طرح لڑکا شوہر آج بھی اس کو نصف بہتر سمجھنے کا قائل ہوتا ہے۔ منشی صدیق احمد صاحب اس طرح نصف صاحب اولاد ہو کر اپنی نصف بہتر کے ہاں قائل ہو سکے اور اپنے ارمان کی تکمیل کے لئے پھر چار سال تک بیچارے کو انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ دو فروری ۱۹۰۴ء کو صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تمنا بھی پوری ہو گئی اور اولادِ نرینہ سے بھی ان کی نصف بہتر کی گود ہری ہو گئی۔ سپاہیوں نے گولے داغے بھانڈوں نے ڈھول بجائے۔ نٹوں نے کرتب دکھائے۔ ایک ہفتہ تک چہل پہل رہی۔ لوگوں نے اس ولادت کو وہ اہمیت دی گویا دنیا میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا ہے۔ بچے پیدا ہی ہوتے رہتے ہیں مگر کوتوال شہر کا بچہ ہمیشہ پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہمیشہ پیدا ہو تو ہمیشہ یہی دھوم دھڑکے ہوتے ہیں، کوتوال صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع اگر خود ان ہی کے گھر میں پیدا ہو جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے۔ جس کو دیکھئے بچے کو دیکھنے اور کوتوال صاحب کو مبارکباد دینے کے لئے چلا آ رہا ہے۔ کہیں سے چھٹی آ رہی ہے کہیں سے ناچ رنگ کے ساتھ بدھاوا، کہیں سے کرتے ٹوپی اور کہیں سے محض مٹھائی۔ کوئی کہتا ہے کوتوال صاحب آپ بچے کا نام "بندرابن داس" رکھ دیجئے۔ ایک فارسی پنڈت

جی نے بڑی قابلیت سے فرمایا کہ صاحبزادے کا شبھ اسم شیام بن صدیق رکھ دیجئے۔ مگر عقیقہ کے دن نام رکھا گیا محمد عمرؓ اور تاریخی نام نکلا تسخیر احمد، یہ ان ہی حضرت کا نام اور تاریخی نام ہے جن کو اب شوکت تھانوی کہا جاتا ہے، تھانوی اس لئے نہیں کہا جاتا کہ پیدائش بندرابن تھانہ میں ہوئی تھی بلکہ اس لئے کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اس خاندان کا وطن ہے اور ہر چند کہ اب اس خاندان کے افراد خانہ بدوش نظر آتے ہیں۔ مگر تھانہ بھون کے محلہ محلّت میں آج بھی جتنے ٹوٹے پھوٹے مکانات ہیں وہ اسی خاندان کی اولوالعزمی کے مزار سمجھے جاتے ہیں۔

بیہوشی کی باتیں

پیدائش سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب تک کہ بچہ ہوش نہ سنبھالے۔ دراصل اس کی ذاتی زندگی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک کھلونے کی ہوتی ہے جس سے اس کے والدین جس طرح ان کا جی چاہتا ہے کھیلتے ہیں۔ اور سمجھتے یہ ہیں کہ بچہ کھیل رہا ہے۔ حالانکہ بچے کا ہر کھیل خود ان کا کھیل ہوتا ہے اور بچے کی آڑ میں بچے سے زیادہ یہ خود کھیلتے ہیں میں اپنے اس زمانہ کو اپنا ذاتی زمانہ نہیں بلکہ روایتی زمانہ کہہ سکتا ہوں اس لئے کہ اس دور کی کوئی بات بھی مجھے یاد نہیں۔ البتہ اس دور کی کچھ روایتیں سنی ہیں جن میں سے چند قابل ذکر ہیں اور ان کو اجمالی طور پر بیان کر کے میں اس دور سے گذر جانا چاہتا ہوں۔ سنا ہے کہ میرا یہ زمانہ زیادہ تر بیماریوں میں گزرا۔ والد صاحب کی رشوت کی تمام آمدنی ڈاکٹروں

کی فیس اور دواؤں کی قیمت میں صرف ہوجاتی تھی۔ مالِ حرام بجائے حرام کیونکر صرف نہ ہوتا۔ ضعف معدہ کی شکایت اس قدر شدید تھی کہ ڈاکٹروں نے غذا پر نہایت سخت پابندیاں عائد کردی تھیں۔ سنا ہے کہ اس زمانہ میں ہم کو کھانے کے وقت کا نہیں بلکہ والد صاحب کے کھانے کے وقت کا انتظار رہتا تھا تاکہ وہ کھانا کھانے کے بعد انگلیاں ہم کو چٹا دیں۔ یہ واقعہ ہے اس وقت کا جب عمر غالباً سات سال تھی اور اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ ہم نے پہلا شعر اسی فاقہ مستی سے متاثر ہو کر اسی عمر میں کہا تھا۔ حالانکہ اس وقت نہ گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ نہ کسی قسم کا کوئی ادبی ماحول مگر شاعری اور فاقہ مستی میں چولی دامن کا ساتھ ہے وہ یہاں بھی کارفرما ہوا اور سات سال کے اس فاقہ مست نے غیر شعوری طور پر ایک مطلع عرض کیا۔ ملاحظہ ہو ؎

ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں
نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں

روایت ہے کہ ایک سینٹھے میں کپڑا لپیٹ کر ہم گویا علم بناتے تھے اور یہ علم اسی مرثیہ کے ساتھ اٹھاتے تھے۔ اور پھر زور شور سے ماتم ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں والد صاحب کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ اور لکھنؤ میں بچوں کا علم اٹھانا یا مرثیہ پڑھنا کوئی عجیب بات نہیں، دن رات وہ یہی دیکھتے رہتے ہیں۔

ہوش کی باتیں

میری زندگی کا وہ دور جس پر میں خود روشنی ڈال سکتا ہوں، بھوپال سے شروع

ہوتا ہے جہاں والد صاحب کی خدمات یو پی پولیس سے حاصل کی گئی تھیں۔ اور آپ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ پر فائز تھے۔ میں نے اپنی ہوش کی آنکھیں بھوپال کے ایک عالیشان مکان میں کھولیں۔ باہر ایک پولیس گارد پہرہ پر رہتا تھا۔ اندر ہمارا پورا خاندان، کئی کئی ملازم ہمارے ساتھ کھیلنے کے لئے ماموں کے بچے، ناز برداری کے لئے ماں باپ سے لے کر دور اور قریب کے رشتہ دار بلکہ آئے گئے تک سب، بڑے لاڈ پیار میں زندگی کے دن گزر رہے تھے کہ معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دے دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا چاہئے۔ اور آخر کار ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے۔ معلوم ہوتا تھا ہٹلر کا تماشہ شروع کریں گے۔ ویسی ہی سر پہ پگڑی، وہی الجھی ہوئی داڑھی، ہوبہو گڈھی نما چہرہ معلوم نہیں وہ خود بھی کچھ پڑھے لکھے تھے یا نہیں۔ بہرصورت ہمارے لئے ان سے بہتر معلم بھوپال میں گویا کوئی اور نہ مل سکا۔ ان حضرت نے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈروں کو رٹانا شروع کیا مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والد صاحب نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر آئے جو چوتھے دن اس لئے نکال دیئے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے، اور مار پیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا ہماری والدہ کی پرسنل اسسٹنٹ بوا جعفری خانم نے جو ہمارے حق میں گویا مشیر تعلیمات بھی تھیں۔ والدہ سے کہا کہ "اے ہے موئے ماسٹر کو صدقے کردں اپنے بچے پر سے نگوڑے کی صورت دیکھ ننھا سا کلیجہ دہل جاتا ہے بیوی اس موئے کا تو آج ہی حساب کر دیجئے۔" چنانچہ ان بیچارے کا فوراً حساب

کر دیا گیا۔ اب ایک اور ماسٹر صاحب، آئے جن کا اسم مبارک میر امجد علی تھا بوٹا سا قد، ناک کی پھنگی پر روپہلی عینک۔ منہ میں کچھ دانت اور باقی پان جیب میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیر میں لٹکا ہوا قطب نما اس وقت بھی ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ اسی زمانہ میں ایک جوتے کی پالش بہت چالو تھی جس کی پر بلی کا چہرہ ہوتا تھا۔ ہمارے یہ ماسٹر صاحب بالکل اسی بلی کی شکل کے تھے اور مزاج تو ایسا لاجواب پایا تھا کہ خدا ہر طالب علم کو ایسا ہی ماسٹر عطا فرمائے۔ آنکھ موچی دھپ کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ ماسٹر صاحب دوسرے ہی دن ہٹائے گئے۔ اور پھر زندگی بھر ہم کو ان کا نعم البدل نہ مل سکا۔

الگزنڈرا ہائی اسکول

بھوپال میں اس وقت دو ہائی اسکول تھے۔ ایک الگزنڈرا ہائی اسکول اور دوسرا جہانگیریہ ہائی اسکول، الگزنڈرا ہائی اسکول صاحبزادگان بلند اقبال کا اسکول سمجھا جاتا تھا۔ اور جہانگیریہ ہائی اسکول بندہ زادوں کی تعلیم گاہ تھی الگزنڈرا ہائی اسکول کے ٹھاٹھ ہی کچھ اور تھے۔ طالب علموں کے لئے وردی ضروری تھی سیاہ شیروانی اور آسمانی صافہ، عمارت بڑی پر تکلف، سامان سب قیمتی، مختصر یہ کہ ان دونوں ہائی اسکولوں میں اس وقت یہ کھلا ہوا امتیاز تھا۔ گویا ایک دارالامراء ہے اور دوسرا دارالعوام، والد صاحب نے لوگوں کے کہنے سننے میں آکر آخر ہمارا داخلہ الگزنڈرا ہائی اسکول کے INFAVTS CLASS یعنی جماعت اطفال میں کرا دیا۔ اب ہم سیاہ شیروانی اور نیلے صافے میں ایک سپاہی کے

ساتھ الگزنڈرا ہائی اسکول جانے لگے۔ دوپہر کو ایک دوسرا سپاہی ٹفن کیریر میں کھانا لے کر آتا تھا اور ہم پڑھتے کیا تھے۔ اسکول میں بھی گڑیا کھیلتے تھے۔ اس زمانہ کے اپنے کسی ماسٹر کا نام ہم کو یاد نہیں رہا۔ البتہ اپنے دو ہم جماعتوں کا نام ابھی یاد ہے۔ اور حلیہ بھی ذہن میں محفوظ ہے ایک کا نام مظفر تھا اور دوسرے کا منو میاں ہماری دوستی ان دونوں سے اس قدر بڑھ گئی کہ کچھ دنوں کے بعد جب ہماری استعداد کا اندازہ کرنے کے بعد درجہ چڑھانے کی رائے ہوئی تو ہم نے رونا شروع کر دیا۔ ماسٹر حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے ترقی پر رونے کا کون سا موقع ہے مگر ہم نے صاف انکار کر دیا کہ مظفر اور منو میاں کو چھوڑ کر ہم ترقی پر نہ جائیں گے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ترقی کا تصور ہی ہمارے ذہن میں نہ تھا۔ اور نہ تعلیم کی سنجیدگی سوائے اس کے کہ کبھی ہم سمجھ سکے کہ ہم کو کھیل سے روکنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ کہ پڑھنے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی واقعہ ہے کہ عقلمند بھی کافی تھے۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ سید لیاقت علی صاحب کا (جو اب سر سید لیاقت علی ہیں) سامان ہمارے یہاں امانتاً رکھوایا گیا اس لئے کہ سر لیاقت علی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن بریلی تشریف لے جا رہے تھے۔ والد صاحب نے ہم سب کو جمع کر کے نہایت سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اس سامان کی کوئی چیز ہم لوگ ہرگز نہ چھوئیں۔ حالانکہ اس سامان میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کو نہ چھونا کفران نعمت کا درجہ رکھتا تھا۔ مگر اب تو ممانعت ہو ہی گئی تھی۔ کرتے تو کیا کرتے۔ پھر بھی اس دن جب یہ اطمینان ہو گیا کہ والد صاحب اب دوپہر کا کھانا کھا کر سو گئے ہیں

اگر ہم ان چیزوں کو چپکے سے چھو بھی لیں تو ان کو اطلاع نہیں ہو سکتی۔ ہم نے چپکے چپکے ایک ایک چیز کو چھونا شروع کیا۔ گھومنے والی کرسی کو چپکے سے نچایا جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر جھولے۔ الماری کے اندر بند ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ اس سے چور اور شاہ کے کھیل میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ مختلف چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے ایک بڑی خوبصورت سی گھڑی کو جو ہم نے چھوڑا اور اس کے کل پرزوں کا جو جائزہ لیا تو اس کمبخت نے ایک دم شور مچا دیا۔ اور لگی اس کی گھنٹی بجنے اب لاکھ لاکھ اس کے آگے .... ہاتھ جوڑتے ہیں توبہ کرتے ہیں۔ کان پکڑتے ہیں۔ مگر وہ نہ اب چپ ہوتی ہے نہ جب۔ کرتے کے دامن میں اسے چھپایا الماری کے اندر اسے بند کرنے کی کوشش کی اور آخر عین اس وقت جب کہ ہم اس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے اور وعدہ کر رہے تھے کہ اب تم سے نہ بولیں گے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ والد صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ انھوں نے بہت پیار سے ہم کو بلا کر کہا:۔

"دیکھ لیا تم نے چوری کبھی نہیں چھپتی اور جو بڑوں کا کہنا نہیں مانتے ان کا بھانڈا اسی طرح پھوٹتا ہے۔ اچھا اب کبھی ان پرائی چیزوں کو نہ چھونا"

گھڑی نے اس بڑی طرح چغلی کھائی تھی کہ ہم واقعی سہم کر رہ گئے تھے۔ اور اس کے بعد ہم نے وہ سامان پھر کبھی نہیں چھوا۔ مطلب کہنے کا یہ کہ الارم کو گھڑی کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر بند کرانے کی کوشش کرنے والا عقلمند اسکول میں ترقی ملنے پر اگر رو دیا تو تعجب کی بات نہیں ہے مگر یہ ترقی زبردستی ہمارے سر منڈھ دی گئی اور ہم کو درجہ اول میں جانا پڑا۔ الگزنڈرا ہائی اسکول میں ہمارا بہت کم

زمانہ گذرا۔ اس لئے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت ترک کر دی اور ہم لوگ لکھنؤ آگئے۔ اس اسکول کی پڑھائی اور اس کے ماحول وغیرہ کے متعلق ہم کوئی مستقل رائے قائم کرنے کے قابل ہی نہ تھے اور نہ کوئی رائے قائم کر سکے۔ البتہ اتنا تو ہم کو اب بھی احساس ہے کہ اسکول کی تعلیم یا پرائیویٹ ٹیوٹروں کی تمام جدوجہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہوا جو بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی طرف سے ہم کو حاصل ہو رہی تھی۔ ہمارے ذہن میں نہ معلوم یہ کیوں جم گیا تھا کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی معراج یہ ہے کہ وہ بھائی جان کا ایسا ہو جائے۔ ارشد صاحب ہمارے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں۔ اور ان کے والد ہمارے بڑے ابا اس زمانہ میں بھوپال ہی میں وکالت کرتے تھے۔ بھائی جان کو ہم نے اپنے لئے ایک معیار بنا لیا تھا۔ وہ سوٹ پہنتے تھے۔ ہمارا جی چاہتا کہ ہم بھی سوٹ پہنیں۔ وہ بڑے ٹھسے سے چائے پیتے تھے۔ ہزاروں نخروں کے ساتھ کہ پانی زیادہ جوش کھا گیا ہے۔ پتی کم رہ گئی ہے۔ دودھ میں نقص ہے کہ بھینس نے غالباً حفظانِ صحت کے اصولوں کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ چارہ کھا لیا ہے جس میں وٹامن کی کمی تھی۔ ہم ان تمام باتوں کو سنتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ سمجھ بوجھ ہم میں بھی پیدا ہو جائے کہ دودھ کو چکھ کر بھینس کے مشاغل کا اندازہ کر لیا کریں۔ بھائی جان کے ادبی مشاغل کا رعب بھی قائم تھا۔ ہم ان کے ساتھ ان کے دوستوں کے یہاں جایا کرتے تھے اور وہ جو باتیں کرتے تھے ان کو ہم ذہن میں محفوظ رکھتے جاتے تھے۔

اخبار پھول

اسی زمانہ میں بھائی جان نے ہمارے نام لاہور کا اخبار پھول منگانا شروع کر دیا اور یہ اخبار ہماری تمام اسکول کی کتابوں سے زیادہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ اخبار پر ہمارا پتہ اور چھپا ہوا نام یہ وہ باتیں تھیں جن کو دیکھ دیکھ کر ہم کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ کہ ہم بھی وہ ہیں جس کا نام چھپا ہوا اخبار پر لپٹ کر اس طرح آتا ہے اخبار کی کہانیاں پڑھ کر گھر بھر کو سنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اخبار کا ایک ایک پرچہ بڑی احتیاط سے رکھا کرتے تھے۔ اب بھائی جان نے ایک نئی ترکیب کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں خود لکھتے تھے اور ہمارے نام سے پھول میں چھپنے کو بھیج دیا کرتے تھے۔ اب تو ہمارا پوچھنا ہی کیا۔ مضمون نگار ہو گئے تھے۔ اپنے نام سے چھپی ہوئی کہانیاں سب کو دکھاتے پھرتے تھے۔ دراصل ادبی ذوق اسی وقت بھائی جان نے معلوم نہیں جان بوجھ کر یا غیر ارادی طور پر ان صورتوں سے ہم میں پیدا کیا تھا جس کو بعد میں وہ دوسری صورتوں سے ابھارتے رہے مگر ان کو یہ خیال کبھی بھی نہ تھا کہ یہی ذوق اس لڑکے کا مستقبل بن جائے گا۔ وہ بیچارے نجی طور پر ادیب اور شاعر سب ہی کچھ تھے اور باضابطہ طریقہ پر وکیل اور کورٹ انسپکٹر وغیرہ تھے۔ اخبار پھول کے لیے ہم کو یاد نہیں پڑتا کہ خود ہم نے بھی کچھ لکھا ہو مگر پھول سے اپنی دلچسپی ہم کبھی نہ بھول سکیں گے۔ کیا مجال کہ پھول کا کوئی پرچہ ذرا سا بھی میلا ہو جائے یا کوئی کہیں اٹھا کر لے جائے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ ان حضرت کی اولاد ہے تو یہی اخبار، اور جائداد ہے تو یہی اخبار۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس طرح

بچے اپنی کتابوں پر اپنا نام لکھتے پھرتے ہیں ہم نے کبھی اپنے اخبار پھول پر اپنا نام بھی نہیں لکھا کہ اخبار خراب ہو جائے گا مختصر یہ کہ ہم اپنی سب سے بڑی درسی کتاب اسی اخبار پھول کو سمجھتے تھے۔

حجامت

ہمارے نام پھول آتا تھا اور باجی (ظہور فاطمہ، جواب خاتون ارشد ہیں) کے نام تہذیبِ نسواں، ہم کو تہذیبِ نسواں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، مگر ان کی نیت کبھی کبھی پھول کے لیے ڈانواں ڈول ہوا کرتی تھی۔ اور یہ بات ہم کو پسند نہ تھی وہ ہماری عدم موجودگی میں پھولوں کے ترتیب سے رکھے ہوئے پرچے بے ترتیب کر دیا کرتی تھیں اور ہم آ کر اس بات پر ان سے لڑا کرتے تھے۔ غالباً اسی قسم کی کسی بات پر ایک دن ہم خفا تھے۔ اور وہ ہم کو منا رہی تھیں۔ کہ ہمارے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کس قدر سخت بال ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے سؤر کے بال۔ ہم یہ سن کر پہلے تو چپ ہو گئے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد قینچی لا کر ان کے لمبے لمبے بالوں کی ایک موٹی سی لٹ کاٹ ان کو دیتے ہوئے کہا۔ "لو یہ ریشم کی لچھی"! بڑی آفت مچائی۔ بڑی شکایت کی۔ مگر ہم نے کہہ دیا کہ سؤر کے بالوں کا جواب یہی تھا۔ کہ ریشم کی لچھی پیش کر دی جائے۔

لکھنؤ

سنہ ۱۹۱۴ء میں والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر

بجائے تھانہ بھون جانے کے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ لکھنؤ سے ان کو سوائے سسرالی دلچسپی کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ممکن ہے وطن سے اس لئے بھی دور رہنا پسند کیا ہو کہ خارِ وطن اسی وقت تک سنبل وریحان سے خوشتر محسوس ہوتا ہے جب تک کہ انسان غربت میں اس کا تصور کرتا رہے لیکن جب غربت سے وطن پہونچ کر اس خارِ وطن کو آزمانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو پتہ چلتا ہے کہ خار تو خار یہاں تو سنبل وریحان سب میں خلش موجود ہے۔ میرے دوست وصل بلگرامی کے نام سے ایک شعر مشہور ہے کہ ؎

ان کی گلی کا راستہ طرفہ طلسم راز ہے
دور ہے پاس پاس سا پاس سے دور دور سا

وطن جس قدر غربت میں پیارا معلوم ہوتا ہے، اسی قدر قربت میں اس کی محبت اور کشش ختم ہو جاتی ہے وطن اور اعزہ سے محبت کو برقرار رکھنے کے لئے بہت ممکن ہے کہ والد صاحب نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا ہو۔ حالانکہ مشہور یہی تھا کہ سسرال کی محبت پر گھر کی محبت قربان کر دیا تھانہ بھون کی مٹی لکھنؤ کی خاک کا پیوند بنی۔

بہرحال کچھ بھی ہو۔ والد صاحب نے ذاتی مکان بھی یہیں بنوالیا اور بھوپال سے واپسی پر اسی عروس البلاد کی رنگینیوں میں الجھ کر رہ گئے لکھنؤ میں ہمارے ماموں حکیم محمد یوسف صاحب رہتے تھے۔ حالانکہ ان کے بال بچے سب ہم لوگوں کے ساتھ بھوپال میں تھے۔ اور وہ نہ جانے کیوں اس جمع غائب کے باوجود لکھنؤ میں واحد حاضر رہے۔ لکھنؤ بھی ہم دراصل اس وقت آئے جب ہوش تو آچکا تھا مگر آدمیت سرے سے غائب تھی اور اگر سچ پوچھئے تو باقاعدہ تعلیم اب تک شروع ہی نہ ہوئی تھی۔ والد صاحب اس

سلسلہ میں بلا کے بے پرواہ۔ والدہ صاحبہ بے چاری گھر کی بیٹھنے والی۔ لاکھ چاہا کہ لڑکے کو کسی اچھے استاد کے سپرد کر کے کسی معقول اسکول میں بھیج دیں۔ مگر بس اتنا ہی چلا کہ حضرت مولانا عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا جہاں قرآن مجید کی تعلیم شروع ہو گئی۔ مگر پڑھائی سے زیادہ بڑے لڑکوں کی بری صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کر دیئے۔ نہایت مخرب گالیاں سبق سے زیادہ یاد کر لیں۔ بغل بجانے کے کرتب سیکھے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر مداریوں کے تماشے دیکھنے لگے۔ مدرسہ جانے کے لئے گھر سے چلے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کیلئے اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی میدان میں پہنچ گئے۔ بازاروں سے چاٹ کھانے اور پتے چاٹنے لگے۔ مختصر یہ کہ اس مدرسہ میں جو تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد ہم اسی قابل رہ گئے تھے کہ یکہ ہانکتے یا کباب پراٹھے کی دکان رکھ کر بیٹھ رہتے۔ مگر عین وقت پر والدہ محترمہ کی توجہ پھر اپنے لاڈلے کی طرف ہوئی اور آخر بیچاری نے اپنے میکے والوں سے پڑوسیوں سے اور جو کوئی بھی ان کو نظر آیا سب ہی سے کہہ سن کر ایک ماسٹر گھر پر رکھا۔

ماسٹر چھوٹے لال

ماسٹر چھوٹے لال صاحب لکھنؤ میں ہمارے پہلے پرائیوٹ ٹیوٹر تھے بہت اہتمام سے سر کے بالوں میں تیل لگا کر مانگ اس طرح نکالتے تھے گویا پیشانی کے اوپر دو چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور ان دونوں کے بیچ میں پتلی دیوار کی کشتی نما ٹوپی پہنتے تھے۔ نہ جانے ان کا مشغلہ صرف ٹیوشن تھا یا یہ جو ٹیوشن کرنے نکلتے تھے تو شام

کو گھر پہنچتے تھے۔ نہ جانے کتنے لڑکے پڑھاتے تھے بہت محنت سے پڑھاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سختی نہ برتیں اور سبق یاد کرا دیں۔ مگر ان کو اپنی کوشش میں کامیابی بہت ہی کم حاصل ہوتی تھی۔ ان کی محنت مسلّم مگر شاگرد بھی کوئی معمولی قسم کا ہونہار نہیں تھا۔ بہر صورت ان بیچارے نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب کسی نہ کسی طرح ختم کرا ہی دی اور حساب وغیرہ میں بھی اپنے نزدیک ہم کو چالو کر دیا۔ باقی مضامین بھی ضمنی طور پر ہمارے مطالعے سے وہ بیچارے گزارتے رہے لیکن یہ امید ان کو بھی غالباً نہ ہو سکی کہ یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی۔ بہر صورت وہ اس بیزاری کے ساتھ پڑھانے کا سلسلہ جاری کیے ہوئے تھے کہ صاحبزادے پڑھ گئے تو خدا کی شان اور نہ پڑھ سکے تو مشیت ایزدی میں کیا چارہ۔ ان کو تنخواہ برابر مل جاتی تھی۔ عید، بقرعید، اور شب برات کی رنگین عیدیاں ان کے نو تصنیف اشعار کے ساتھ ہم کو ہمیشہ ملا کرتی تھیں اور ان کو ہمارے یہاں سے اس سلسلہ میں انعام ملتا تھا۔ ہمارے یہ ماسٹر صاحب شاعر بھی تھے۔ عاصم تخلص فرماتے تھے اور اس تخلص کو عید، بقرعید، شب برات کے لیے محفوظ رکھتے تھے۔ عیدیوں والے اشعار میں عاصم جڑ دیا جاتا تھا جس کے متعلق بہت دنوں کے بعد پتہ چلا کہ یہ آپ کا تخلص ہے۔ اور آپ صرف عیدیاں ہی نہیں کہتے کبھی کبھی مشاعروں میں غزلیں پڑھتے ہیں۔ ان کی ایک عیدی کا قطعہ یاد ہے ؎

شب برات آمد بفضلِ کردگار   ہے ہر اک شاداں مثالِ نو بہار
پھلجھڑی چرخی و انار سے   ہے زمیں کا فرش مثلِ لالہ زار

اس قطعہ میں لالہ بجائے خود تخلص معلوم ہوتا ہے۔ اس لالہ شاہی قطعے کے

بعد اگر ان کی کسی غزل کا کوئی شعر یاد نہ رہا ہو تو غالباً اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ماسٹر صاحب کی یہ عیدیاں اس زمانہ میں بڑی دلچسپی سے والد صاحب اور ارشد صاحب پڑھا کرتے تھے۔ اور ہماری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ آخر اس میں اس قدر ہنسنے کی کیا بات ہے۔

تھانہ بھون کا پہلا سفر

اب تک ہم نے اپنا وطن کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور دیکھتے بھی کیسے جب والد صاحب خود وطن سے کتراتے رہتے تھے۔ لیکن ایک دن ہم کو یکایک معلوم ہوا کہ والد صاحب تھانہ بھون جا رہے ہیں۔ اور ہم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کچھ نہ پوچھئے خوشی کا عالم مگر یہ خوشی تھانہ بھون جانے کی نہیں بلکہ محض سفر کی تھی۔ اور والد صاحب کے ساتھ سفر کرنے کی خوشی اس لئے اور بھی زیادہ ہوتی تھی کہ وہ سکنڈ کلاس میں سفر کراتے تھے۔ بہر صورت ہم تھانہ بھون پہونچے اپنے عزیزوں کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ اپنے کھیت دیکھے اپنے گھر دیکھے۔ اسٹیشن پر پہونچ کر تو بہت گھبرائے تھے۔ کہ یا اللہ یہ تو جنگل ہی جنگل ہے مگر جب آبادی میں پہونچے تو تسکین ہو گئی۔ چچا میاں نے اسٹیشن پر ڈرا دیا تھا کہ تمہاری چچی بی بی یہیں کہیں گھاس چھیلتی ہوئی ملیں گی اور ہم ایسے عقلمند کہ کچھ یقین بھی آ گیا تھا۔ مگر گھر جا کر دیکھا تو چچی بی گھاس نہیں آلو چھیل رہی تھیں۔ تھانہ بھون کے اس سفر کی کوئی ایسی بات ہم کو یاد نہیں جس کا اثر ہم پر گہرا پڑا ہو نہ وطن کے مفہوم سے ہم واقف تھے۔ نہ وطن کی کوئی خاص محبت تھی۔ البتہ تھانہ بھون کے پیڑے جب بھی پسند تھے۔ اور اب بھی پسند ہیں۔

آمد نامہ

غالباً والدہ صاحبہ کے طعنوں سے "تنگ آ کر یونہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک دن والد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہم کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ ہمارے لئے آمد نامہ خرید اگیا اور گھر کے باہر ایک میدان میں والد صاحب نے ایک چارپائی پر یہ مکتب کھول دیا۔ ان کا قول تھا کہ کسی کو آمد نامہ پر عبور حاصل ہے تو وہ نہایت آسانی سے شیخ سعدی بن سکتا ہے اور اگر کسی کو پہاڑے یاد ہیں تو اس کا ڈاکٹر ضیاء الدین ہو جانا نہایت آسان ہے۔ چنانچہ وہ ہم کو شیخ سعدی اور ڈاکٹر ضیاء الدین بنانے کی فکر میں ہمیشہ رہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں اول تو کبھی آپ نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ اور اگر کبھی باپ ہو جانے کا خیال آجاتا تھا اور اس ذمہ داری کا احساس کبھی پیدا ہو جاتا تھا تو فوراً پوچھ بیٹھتے تھے کہ بتاؤ ,, نو نواں ؟" اور ہم دل ہی دل میں نو کو نو سے ضرب دینا شروع کر دیتے تھے۔ اور جواب دینے بھی نہ پاتے تھے کہ ادھر سے سوال ہوتا تھا کہ ,, چھ ستے" اور ہم دعا کرتے تھے کہ باہر سے والد صاحب کے کسی دوست کی آواز آجائے۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ ہمیشہ ہماری تعلیم کی طرف سے مایوس ہو جایا کرتے تھے۔ اور والدہ صاحبہ سے کہہ دیا کرتے تھے کہ نہ معلوم صاحبزادے کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ والدہ صاحبہ اس سلسلہ میں ان ہی کو ذمہ دار قرار دیتی تھیں۔ اور یہ بحث کبھی کبھی نہایت خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لیتا تھا یعنی کھانے کے برتن ہیں شکستن کا مصدر گردانتے تھے، اور طشتریاں

فرش سے ضرب کھا کر اپنا پہاڑا خود ہو جایا کرتی تھیں۔ خیر یہ تمام باتیں غنیمت تھیں۔ اس لئے کہ ان کا کوئی تعلق ہم سے براہ راست نہ تھا۔ مگر والد صاحب کا یہ فیصلہ کہ وہ خود آمدنامہ پڑھائیں گے۔ ذرا خوفناک تھا۔ ماسٹروں سے تو اب تک یہ کہا جاتا کہ لڑکے کا گوشت پوست آپ کا اور ہڈیاں ہماری یعنی اس طرح ماریئے کہ کھال ادھڑ جائے مگر ہڈی نہ ٹوٹے لیکن یہاں تھا باپ کا معاملہ، گوشت پوست کے علاوہ ہڈیاں بھی اب پرائی نہ تھیں۔ ع

موت آئی تو ٹل نہیں سکتی

آمدنامہ لے کر میدان میں چارپائی پر ان کے سامنے بیٹھنا ہی پڑا اور آمد۔ آمدند، آمدی۔ آمدید، آمدم۔ آمدیم۔ کا پہلا سبق ہم کو دیا گیا۔ پہلا دن پہلا سبق اور والد صاحب سے پہلا سابقہ مگر معلوم ہوتا تھا کہ شامت اس پہلی ہی منزل پر استقبال کے لئے آئی ہوئی تھی۔ لاکھ لاکھ کوشش کرتے ہیں کہ سبق یاد ہو جائے ورنہ والد صاحب کے کوئی دوست آجائیں مگر نہ یہ ہوتا ہے نہ وہ۔ جھوم جھوم کر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے رٹتے ہیں۔ مگر دماغ کسی طرح اس غیر زبان کو قبول نہیں کرتا۔ یا اللہ یہ کس گناہ کا عذاب ہے جس کا نام ہے آمدنامہ۔ والد صاحب نے ایک گھنٹہ کا وقت دیا تھا۔ اس پہلے سبق کو سننے کے لئے اور یہاں کے آثار یہ تھے کہ ع

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

آخر موت کی گھڑی آپہونچی۔ والد صاحب سبق سننے کے لئے بیٹھ گئے اور [illegible] کورے کے کورے گویا اب تک کچھ پڑھا ہی نہیں ہے آخر طوفان امڈا! برق و رعد، زلزلہ، انہدام، چیخیں، گریہ، حقے کی چلم الٹ گئی۔ آمدنامے کے پڑھنے

فضا میں ایران کی آزادی کے پرچم اڑانے لگے۔ اور ہم ہندوستان کی غلامی کی زندہ تصویر بنے اپنی موت کے منتظر سر نگوں بیٹھے ہی تھے کہ یکایک والد صاحب نے پکڑ کر جو ہم کو جھنجھوڑا ہے تو تہذیب کا کرتہ معہ بنیائن ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس کا گریبان ہمارے برہنہ جسم پر معلوم یہ ہوتا تھا کہ فارسی کی سب سے بڑی فضیلت حاصل کی ہے۔ اور یہ کوئی خاص ایرانی جبہ ہے۔ جو ہم پہنے بیٹھے ہیں۔ کپڑوں کے بعد اب غالباً کھال کی باری تھی۔ کہ اس ہنگامہ کی اطلاع پاکر ماموں صاحب گھر سے نکل آئے۔ والدہ نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا۔ راہ گیر چلتے چلتے کھڑے ہو گئے۔ اور کتے نے دم ہلانا چھوڑ دی ماموں صاحب نے آکر ہم کو وہاں سے اٹھایا اور بمشکل تمام گھر کے اندر پہنچا دیا اور والدہ صاحبہ نے سچے دل سے توبہ کی کہ اب کبھی والد صاحب کو ہماری تعلیم کی طرف متوجہ نہ کریں گی۔ گویا یہ سبق والد صاحب نے ہم کو کم اور والدہ صاحبہ کو زیادہ دیا تھا

کالرہ

بھائی جان مولانا ارشد تھانوی بھوپال سے جب کبھی لکھنؤ تشریف لاتے تھے ہم گویا ان کے ضمیمہ کے طور پر ساتھ ہی ساتھ رہتے تھے۔ اس زمانہ کے ان تمام دوستوں سے ہم مل چکے تھے۔ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی حضرت محوی صدیقی بخاری عباس حسین ایڈیٹر رسالہ تمدن۔ مولانا ظفر الملک علوی۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت اور مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محل وغیرہ۔ ان حضرات کے یہاں کی تمام دعوتوں میں بھائی جان کے ساتھ مدعو ہوتے تھے۔ اور بھائی جان

جب ان حضرات کو اپنے یہاں بلاتے تھے اس وقت بھی ہمارا دسترخوان پر ہونا ضروری تھا۔ اس قسم کی ایک ٹی پارٹی میں صبح بالائی اور نہ جانے کیا کیا خاک بلا ہم نے کھائی۔ اور ایک بجے ہم پر کالرہ کا نہایت شدید حملہ ہوا یہاں تک کہ مغرب کے وقت ہماری حالت غیر ہوگئی۔ اور ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو نبضیں بھی ڈوب چکی تھیں اس وقت ہمارے تو ہوش بجا نہ تھے مگر سنا ہے کہ باجی رضاتون ارشد نے اپنے معصوم بچے سلمان الارشد کو گود میں لے کر کہا کہ اے خدا تو میرے بھائی کو تندرست کر دے۔ خواہ میرا یہ بچہ مجھ سے چھین لے۔ اللہ میاں کے یہاں تاوان لینے کا دستور تو ہے ہی نہیں مگر غالباً ان کی یہ دعا سن لی گئی۔ اور اس آخری حالت پر پہنچنے کے بعد ہم صحت یاب ہونا شروع ہو گئے۔ اب پرہیز بہت سخت تھا۔ فاقوں پر فاقے آخر ایک دن ہم نے ڈاکٹر سے جب یہ سنا کہ آج کے تیسرے روز مونگ کی دال کا پانی ملے گا۔ تو اپنے ایک عزیز بچے کو چپکے سے پیسے دیئے کہ دو آنے کے لاؤ کباب اور دو آنے کے لڈو ریوڑیا اور اس خطرناک حالت میں یہ بدپرہیزی چپکے سے کر گزرے۔ مگر کوئی نقصان نہ پہنچا ایک دوسری لاجواب چوری یہ کی کہ باجی بھوپال جانے کے لیے تیار ہوئیں۔ ان کے لئے ناشتہ میں منجملہ اور چیزوں کے کھجوریں بھی تلی جا رہی تھیں۔ ہم نے آنکھ بچا کر تین کھجوریں اڑا لیں اور ان کو اطمینان سے کھانے کے لئے پاخانہ میں پہنچ گئے۔ باجی نے کچھ تاڑ لیا اور وہ بھی پیچھے پیچھے پہنچیں۔ ہم یونہی بیٹھے شوق فرما رہے تھے کہ انھوں نے آنا چاہا ہم کھنکھارے مگر جواب ملا کہ ہم تو آئیں گے۔ اور فوراً سامنے آکر موجود ہو گئیں آدھی کھجور منہ میں تھی آدھی ہاتھ میں زود سنڈاس میں پھینک دیں اب جو انھوں

نے پوچھا کہ آپ پاجامہ باندھے قدمچوں پر کیوں تشریف فرما ہیں تو مجبور کو بمشکل تمام نگل کر جواب دیا کہ بھول گئے تھے۔ مگر چوری پکڑی جا چکی تھی اور اب ہم کھسیانے ہو کر غصہ پر تل گئے تھے۔

مولانا عبدالرحیم کلیم

مولانا کلیم والد صاحب کے دوست تھے۔ مگر خدا نے مولانا کو شاید اسی لئے پیدا کیا تھا کہ والد صاحب ان پر اپنی تمام ذہانت صرف کرتے رہیں مولانا کو دیکھتے ہی عجیب عالم ہو جاتا تھا والد صاحب کا۔ نہ جانے کس قیامت کی آمد ہوتی تھی۔ ہر مرتبہ نئی پھبتی سوجھتی تھی۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ مولانا تھے ہی بڑے پھبتی زیب۔ نہایت سیاہ رنگ، چھوٹا سا قد، دوہرا جسم، چہرے پر بال تقریباً ندارد اور شکل ایسی کہ واقعی کسی انسان کی ایسی صورت اب تک ہم نے نہیں دیکھی۔ جانوروں میں البتہ بہت سے جانوروں کو ان سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ والد صاحب ان کو زنجبار کا پرنس کہتے تھے۔ کبھی کلکتہ کے "زو" کا مفرور بن مانس کبھی ڈارون کے نظریات کا ثبوت۔ اور ان سے ہمیشہ حد سے گزرا ہوا مذاق ہوا کرتا تھا۔ والد صاحب اور ان کے لطیفے آج تک لوگ دہراتے ہیں مولانا کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے ایک آدھ واقعہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بیان کرنا ضروری ہے اور پھر میں یہ ذکر کروں گا کہ میرے حالات میں مولانا کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔

لکھنؤ میں ایک تھیٹریکل کمپنی کے ساتھ کلکتہ والی گوہر جان آئی ہوئی

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

تھی اور حال یہ تھا کہ بہشتی اپنی مشکیں بیچ بیچ کر اور لوگ قرض لے لے کر بار بار تماشہ دیکھنے جاتے تھے ہر طرف گوہر جان کے نغمے گونجے ہوئے تھے۔ اور اسی تھیٹر کے چرچے تھے۔ والد صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اشتیاق بھائی سے جو آج کل اشتیاق احمد عباسی بیرسٹر ہیں۔ یہ کہا کہ تم کو ڈرائنگ کا بہت شوق ہے۔ تم سات آٹھ تصویریں بن مانس کی ذرا پوسٹر کے کاغذ پہ بنا دو۔ چنانچہ یہ تصویریں فوراً تیار ہو گئیں۔ نہایت خوفناک بن مانس سات آٹھ کاغذوں پر تیار ہو گیا۔ اب ان پوسٹروں پر عبارت لکھی گئی کہ "آج شب کو کلکتہ کی مس گوہر کے نغمے کے بعد لکھنؤ کے مولوی عبدالرحیم صاحب کلیمؔ اپنا شہرۂ آفاق بن مانس کا پارٹ ادا کر کے شائقین سے خراجِ تحسین حاصل کریں گے"۔ ایک پوسٹر مولانا کے دروازے کے بالکل سامنے باقی ان مقامات پر جو مولانا کی گذرگاہ تھے۔ راتوں رات چسپاں کر دیئے گئے۔ اور حسبِ توقع صبح مولانا نے گھر سے نکلتے ہی جو اس پوسٹر کو دیکھا تو آگ بگولا ہی تو ہو گئے۔ اپنی چھڑی سے اس پوسٹر کو لوگوں کی نظریں بچا بچا کر نوچا۔ اور نہایت برہمی کے ساتھ اس ارادہ کے ساتھ کوتوالی پہونچ کر والد صاحب سے اس زیادتی کی شکایت اور تفتیش کا مطالبہ کریں گے روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ بس یہی ایک پوسٹر ہوگا۔ مگر بازار میں پہونچے تو وہاں لوگوں کا ایک ہجوم اس پوسٹر کو پڑھ کر دلچسپی لے رہا تھا۔ مولانا نے گھبرا کر راستہ کاٹا۔ بجائے سڑک کے ایک گلی میں گھس گئے۔ مگر اب جو کوتوالی کے دروازے پر پہنچے ہیں تو وہاں بھی پوسٹر اور پڑھنے والوں کا ہجوم۔ قہقہوں کا شور اور پھبتیوں کی بوچھاڑ۔ مولانا بہت ہی گھبرا گئے اور کسی نہ کسی طرح تمام نظروں سے اپنے آپ کو

بچاتے ہوئے گھر جا کر بیٹھ رہے۔ آخر کار پتہ چل گیا کہ یہ حرکت کس کی تھی خفا ہوگئے۔ بات چیت، دعا سلام، مرنا جینا سب ترک عاشورہ کے دن حسین آباد کی ضریح کا جلوس نکلنے کے بعد والد صاحب نے دیکھا کہ مولانا برہنہ سر، برہنہ پا تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ نے مولانا کو مخاطب کئے بغیر عم محترم چودھری شفیق الزماں صاحب تعلقدار گرلھی سے فرمایا "شفیق بھائی کلیم سے لاکھ لڑائی سہی، مگر اس میں بعض خصوصیات تو ایسی ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا" مولانا یہ سنتے ہی تمام لڑائی جھگڑے کو بھول کر ان لوگوں کے پاس آگئے اور والد صاحب سے فرمایا "کیسی لڑائی اور کہاں کا جھگڑا۔ مگر تجھے میری قسم صدیق وہ تو ابھی کیا کہہ رہا تھا" والد صاحب نے فرمایا "میں آپ سے تو کچھ کہہ نہیں رہا تھا اور نہ میں خوشامد کو پسند کرتا ہوں۔ البتہ جو واقعہ ہے اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ شفیق بھائی سے یہی کہہ رہا تھا کہ کلیم صاحب کی بعض خصوصیات سے انکار نہیں ہو سکتا" مولانا نے اور قریب ہو کر کہا "وہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ تجھے خدا کی قسم بتا تو سہی مجھے بھی" والد صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا "ارے مثلاً آپ کا چہرہ ماہی مراتب کے ساتھ جلوس کے آگے گزر گیا۔ اور آپ یہاں ٹہل رہے ہیں" پھر وہی گالیاں وہی برہمی اور وہی دشمنی جس پر ہزاروں دوستیاں قربان ہو سکتی ہیں۔ ایک دعوت کے موقع پر والد صاحب کو پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ایک دوست کے نہایت گورے چٹے بچے کو مولانا کھلا رہے ہیں۔ بچہ ان کے کندھے پر بیٹھا تھا لوگوں نے والد صاحب سے شکایت کی آخر اتنی دیر کیوں کر دی آپ نے نہایت تشویش

سے فرمایا۔ سال کا شگون نکل رہا تھا۔ میں بھی ذرا وہاں ٹھہر گیا۔ مگر خدا ہی خیر کرے اب کی نوروز سؤر پر سوار ہے۔" محفل میں قہقہہ پڑا اور مولانا نے بدحواس ہو کر بچے کو کندھے سے اتار دیا۔ والد صاحب نے وصیت نامہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو مولانا کی سوانح حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ احباب میں بے حد مقبول تھی اور اس کو سننے کے لیے محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد اس وصیت نامہ کی اشاعت پر زور دیا گیا۔ مگر میں نے اس کتاب کی اشاعت کو کسی طرح مناسب نہ سمجھا۔ جس کو خود والد صاحب نے باوجود اس قدر مقبولیت کے طبع کرانا کبھی پسند نہ کیا۔ مولانا کلیمؔ کی پہنچ اسی مذاق کے سلسلہ میں والد صاحب کے ساتھ ساتھ مہاراجہ صاحب محمود آباد، مہاراجہ صاحب رامپور اور اسی طرح تمام اونچی سوسائٹی میں تھی۔ اور ہر جگہ مولانا سے یکساں طور پر دلچسپی لی جاتی تھی۔ مولانا کے انتقال کے بعد یہ احساس تو خود مجھے بھی ہوا تھا کہ والد صاحب کچھ بجھ کر رہ گئے تھے۔ گویا مشق سخن کے لیے مصرع طرح باقی نہ رہا تھا اور طبع آزمائی اب غیر طرحی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یا پرانے کلام سے داد حاصل کرنے کا طریقہ باقی رہ گیا تھا۔ خیر یہ داستان تو بہت طویل ہے مولانا کے لطائف کہاں تک بیان ہو سکتے ہیں۔ دفتر کے دفتر سیاہ کر دیجیے تو بھی ان کی سیاہی کا پورا مفہوم پیش کرنے سے قاصر رہیں گے۔ یہ حکایت جس قدر بیان کی جائے اسی قدر لذیذ اور طویل ہوتی چلی جائے گی۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں مولانا کو کس قدر شامل پاتا ہوں اس کو بیان کر دوں۔

عہد نامہ کے سلسلے میں جو عذاب مجھ پر نازل ہوا تھا اس کے بعد بھی والد صاحب کو اطمینان نہ ہوا۔ اور آپ نے عذاب کے ایک مستقل فرشتے یعنی مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کرنے کا ہمارے متعلق فیصلہ کر دیا۔ مولانا فارسی کے بہت بڑے فاضل تھے۔ فارسی میں شعر بھی خوب کہتے تھے۔ اور روز سا کے یہاں فارسی پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ تو سب کچھ درست مگر اس استاد سے تعلیم حاصل کرنا جس کی صورت دیکھ کر خواب تو خواب عالم بیداری میں انسان اچھل پڑے۔ عذاب نہیں تو اور کیا تھا مگر چونکہ ہمارے فارسی اعمال اسی کے مستحق تھے لہذا طے یہ ہوا کہ ہم روزانہ مولانا کے در دولت پر حاضر ہوا کریں اور ان سے فارسی پڑھا کریں اور مصیبت بالائے مصیبت ملاحظہ ہو کہ باہر تو صرف مولانا کا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ آپ ایک برائے نام خرقہ باندھے "لال لنگوٹے والے کی جے" بول رہے ہیں۔ اور خود ہی اس جے کے مخاطب بھی نظر آتے ہیں۔ ایک دم ڈنر سوٹ والا رنگ اس پر وہ رخ روشن اور ادھر ادھر ہلتی ہوئی گردن بلکہ معاف کیجیے گا یہ تو غلط بیانی ہو گئی گردن تو تھی نہیں۔ کندھوں سے چہرہ براہ راست ملا دیا گیا تھا۔ مولانا کو اس عالم میں دیکھ کر سندباد جہازی والا تسمہ پا یاد آ گیا اور کبھی خیال یہ ہوا کہ الہ دین کا چراغ تو گل ہو گیا ہے اس کا یہ ڈیوٹ سا موکل اب تک موجود ہے نہ معلوم ہم کو کس موت مارے گا۔ یہ مولوی دل سے دعا نکلی کہ اے رب العالمین یہ صاحب خواہ انسان ہوں یا نہ ہوں ہمارا آمدنامہ چھین کر درخت پر چڑھ جائیں تو ہم پانچ پیسے کی شیرینی پر ان کی نیاز دلوا دیں مگر اس قسم کی دعائیں ذرا مشکل سے قبول ہوتی ہیں البتہ

اتنی ضرور قبول ہوئی کہ مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھانا شروع کر دیا۔ کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی اور جو دہشت ان کی صورت دیکھ کر قائم ہو لی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دلنشین تھا اور وہ کچھ اس انداز سے سمجھاتے تھے۔ کہ وہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر ان کی بات سمجھ میں آ جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لیے چند ہی دنوں میں آسان ہو گئی

خالو مدن اور ان کا لال اسکول

محض فارسی کے بل بوتے پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی مغلوں کا دربار تو ہے نہیں کہ انسان اپنے گھریلو علوم میں فاضل ہو کر ابوالفضل بن جائے۔ والد صاحب کو سب سے زیادہ فکر تو یہ تھی صاحبزادے کی عمر بڑھ رہی ہے اور باقاعدہ تعلیم کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آخر ان کے کام ان کی ایک بہن آئیں۔ جن کے شوہر ایک مڈل اسکول میں ملازم تھے۔ ہمارے ان خالو کا اسم گرامی تھا "سید محمود رضا" اور کہلاتے تھے "مدن"۔ والدہ صاحبہ ان کو صرف مدن کہتی تھیں اور ہم خالو مدن۔ والدہ صاحبہ نے ان بزرگ کو ہمارا مشیر تعلیم مقرر کر دیا۔ اور ہمارے ان خالو مدن نے ایک آدھ حساب کا سوال ہم سے حل کرایا، کچھ اردو پڑھوائی کچھ انگریزی کا جائزہ لیا اور نہایت ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا "نتھنگ" یعنی کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ لہذا انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمارا داخلہ ان کے اسکول میں کر دیا جائے۔ ان کے اسکول کا نام لال اسکول تھا۔ اس لیے کہ وہ سرخ رنگ سے رنگا ہوا تھا اور در اصل چرچ مشن ہائی اسکول کی برانچ تھا۔ خالو

مدن اس اسکول میں ماسٹر بھی نہیں بلکہ مولوی تھے۔ بہرحال ان کا اتنا ضرور تھا کہ ہم باوجود نالائق محض ہونے کے چوتھے درجے میں لے لئے گئے۔ اور پہلے ہی سال نہ جانے کیونکر چوتھا درجہ پاس کر کے پانچویں میں آگئے۔ اب ایک نیا مرض شروع ہو گیا سینہ میں درد کے دورے پڑنے لگے۔ الامان والحفیظ اس قدر شدید درد کہ خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے محفوظ تو خیر ہم بھی تھے۔ مگر درد تھا بڑا ظالم ایک تو یہ کہ ٹھیک پونے دس بجے دن کو شروع ہوتا تھا ۹½ بجے اس لئے نہیں کہ ممکن تھا کہ لوگ کھانے کو ٹوٹ کر پڑتے اور دس بجے اس لئے نہیں کہ پھر بعد از وقت ہوتا تھا۔ وہ اسکول کا وقت مقرر تھا۔ ۹½ بجے کھانا کھا کر کتابیں سنبھالیں کپڑے پہن کر کھڑے ہوئے اور درد کا دورہ شروع ہو گیا۔ اب کوئی کتابیں سنبھال رہا ہے کوئی شیروانی اتار رہا ہے کسی نے ٹوپی تھامی تو کسی نے جوتا اتارا اور ہم کو کسی نہ کسی طرح بستر پر پہنچا دیا گیا ـــ دس بجے ساڑھے دس بجے اور آخر کم ہوتے ہوتے گیارہ بجے تک درد ختم۔ اور اسکول غائب اب ہم چاہے کھیلیں چاہے چین کی بنسی بجائیں کوئی پوچھنے والا نہیں پھر لطف یہ کہ عجیب سمجھدار علالت تھی کہ اتوار کو کبھی اس درد کا دورہ نہ پڑا۔ یہاں تک کہ باقی چھٹیوں میں بھی درد کی کوئی شکایت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ دراصل یہ تھا کہ لالی اسکول میں ایک تھے ماسٹر پنڈت بھولا ناتھ جی۔ وہ حساب پڑھاتے تھے۔ ان حضرت کو نہ جانے یہ کیا مرض تھا کہ جتنا پڑھاتے اس سے کہیں زیادہ سوال گھر پر کرنے کے لئے دے دیتے تھے۔ اور سوال نہ کئے جائیں تو اپنے والی پٹری آڑی کر کے وہ ہاتھ رسید کرتے تھے کہ آدمی چکر ورقی ہو جائے۔ انہی کے اسی تشدد نے ہم کو اس مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس مرض کا نتیجہ ظاہر ہے

کر دی۔ علاج میں سینکڑوں روپیہ پھونکا گیا۔ والدہ صاحبہ کو مستقل طور پر ہماری صحت کی فکر رہنے لگی۔ اور سہ ماہی امتحان کا نتیجہ جو نکلا تو ہم سوائے اردو اور فارسی کے ہر مضمون میں اولوالعزمی سے فیل ہوئے تھے۔ ششماہی میں بھی فیل ہوئے اور سالانہ امتحان میں تو کمال ہی ہو گیا۔ جس روز نتیجہ سنایا جانے والا تھا مسٹر بنجمن پال نے لڑکوں کو ہدایت کر دی کہ ذرا صاف کپڑے پہن کر آئیں۔ اسکول کے انسپکٹر آئیں گے۔ اور وہی نتیجہ سنائیں گے۔ چنانچہ سب سے زیادہ شاندار لباس ہمارا تھا۔ ہر ایک ہمارے ٹھاٹھ دیکھ کر ایک مرتبہ غور سے ضرور دیکھتا تھا۔ مسٹر بنجمن پال نے بھی ہمارے یہ ٹھاٹھ دیکھے تو ہنس کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے اپنی جماعت میں سب سے اول تم ہی آنے والے ہو۔ مگر نتیجہ جو سنایا گیا تو ہم فیل تھے۔ اسی شاندار لباس کے ساتھ اپنی شاندار ناکامی کا مژدہ ہم نے سنا۔ ہمارے آنسوؤں نے گھر آ کر سنایا خوب خوب رو دیئے۔ دوسرے سال خدا خدا کر کے پاس ہوئے اور تیسرے سال چھٹا درجہ پاس کر کے لال اسکول کو چھوڑ دیا اس لئے کہ اس اسکول میں چھٹے درجے ہی تک تعلیم ہوتی تھی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد

اب ہمارا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں ہوا۔ حالانکہ ہم بہت کمزور تھے اور لال اسکول کے طالب علموں کے متعلق ان باقاعدہ اسکولوں کی رائے بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اس لئے داخلہ میں بڑی دقت ہوئی مگر دوڑ دھوپ کی سفارش

سے ساتویں درجہ میں لے لیے گئے۔ اب گویا ہم اچھے خاصے بڑے آدمی تھے۔ ایک بڑے اسکول کے بڑے طالب علم، بڑی کتابیں، بڑے بڑے تعلیم یافتہ استاد، بہت بڑا کھیل کا میدان، بغرض ہر چیز بڑی تھی۔ اور اسی کے ساتھ شرارتیں بھی بڑھیں۔ کچھ دن تک تو اسکول میں بھیگی بلی بن کر رہے اس لئے کہ ایک مڈل اسکول سے آئے تھے۔ اور یہاں کے لڑکے مڈل اسکول کے لڑکوں کو گاؤدی سمجھا کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ہمارے دوستوں کی بھی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ اور پھر آخر تک اس جماعت نے حسین آباد ہائی اسکول میں زندگی کی روح پھونکی۔ پڑھنا لکھنا تو خیر یہاں بھی برائے نام تھا۔ البتہ تمام مشاغل میں ہم پیش پیش تھے۔ مثلاً سب سے پہلے اسکاؤٹ ہم ہوئے کھیل کود کی تمام درخواستیں لے کر ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچتے تھے اسکول کے تمام غیر تعلیمی ہنگاموں میں سب سے زیادہ ہمارا حصہ تھا۔ مگر تعلیم! ——

سخن دراینست شرارتیں اپنے شباب پر تھیں۔ اسکول کے ہر استاد کو معلوم تھا کہ تمام شرارتیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ شرارتوں میں کوئی کمینہ پن۔ کوئی چھوٹی بات اور کوئی ایسی بات کبھی نہ ہوتی تھی کہ جس سے اسکول کی عظمت یا گھرانے کی عزت پر حرف آئے۔ اس کے علاوہ ان شرارتوں میں ذہانت کو بھی کافی دخل ہوتا تھا۔ اور ہم تمام دوستوں میں اتفاق اس قدر تھا کہ کیا مجال کوئی استاد ہم میں سے کسی کا بھید پالے۔ حسین آباد ہائی اسکول ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ اور اس کے متوازی دوسرے ٹیلے پر شاہ پیر محمد صاحب کا مزار اور مسجد اور رنگ ہے ان دونوں ٹیلوں کی درمیانی نشیب میں ایک سڑک ہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ لان برابر کرنے کیلئے پتھر کا وزنی رولر دھکیل

کر اس ڈھال تک لے گئے جس کے نیچے سڑک تھی۔ اور انجام پر غور کیے بغیر محض
یہ تماشہ دیکھنے کے لئے کہ یہ رولر کس طرح ڈھال پر لڑھکتا ہے۔ اب جو اسے
لڑھکاتے ہیں تو اس نے توپ کے گولے کی طرح پہلے تو جا کر نیچے کا جنگلہ توڑا
اس کے بعد سڑک پر جا کر ایک لاری سے متصادم ہو گیا۔ اور لاری کا ایک
حصہ چکنا چور کر دیا۔ اس انجام کا وہم و گمان بھی نہ تھا، سمجھے تھے کہ نہ جانے
کیا آفت بنے گی۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب اس شش و پنج میں تھے کہ اس شرارت
کے کسی ایک دو ذمہ داروں کا پتہ چل جائے تو وہ سزا بھی دیں۔ لاکھ لاکھ
تحقیقات کی مگر تمام جماعت نے صرف یہی کہا کہ قصور سب کا ہے اور ہم سب
ہی تھے۔ جو نتیجہ اس شرارت کا برآمد ہوا ہے اس کی ہم کو خبر نہ تھی۔ اور اب
ہر سزا کے ہم مستحق ہیں۔ آخر مجبور ہو کر تمام جماعت کو مورد الزام قرار دے کر
خفیف سی بید بازی ہو گئی۔ ہم لوگوں نے بعد میں جشن اتحاد منایا جس میں
دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ اور ایک دوسرے کو اس اتحاد و اتفاق پر مبارک باد
دے کر ہم لوگوں نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی تمام قومی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ ہم
سے اتحاد کا سبق لیں۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر مولوی زین العابدین صاحب، ذرا خوش قسم
کے سنجیدہ بزرگ تھے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شرارتوں کو پسند نہیں کرتے مگر از
بعد میں یہ ہوا کہ وہ شرارتوں کو طالب علمی کا پیدائشی حق بھی سمجھتے تھے۔ بشرطیکہ اس شرارت
سے اسکول کے ڈسپلن میں کوئی خاص خلل واقع نہ ہو۔ مثلاً خود یہ خاکسار اپنے تمام
استادوں کی نقل اتارا کرتا تھا۔ ان کے لب و لہجہ سے لے کر ان کی کھڑی بولی تک
کی نقل جو غیر شعوری طور پر سب ہی میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہیں۔ اور جن کا احساس اُن

وقت ہو سکتا ہے جب کوئی بتائے۔ مثلاً کسی کی عادت ہوتی ہے کہ لکھتے وقت منہ چڑھاتا جائے کسی کو یہ مرض ہوتا ہے کہ زبان نکال کر خوشنویسی کرے اسی طرح مختلف قسم کی عادتیں مختلف لوگوں میں نظر آتی ہیں۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی عادت تھی کہ وہ پڑھاتے وقت دانت سے کچھ ریشے برابر نکالتے رہتے تھے ہمارے ہسٹری کے استاد ماسٹر مکرجی کی عادت تھی کہ وہ ایک ادائے خاص کے ساتھ شانے اچکاتے تھے۔ اور سوال کرتے وقت لب زیریں کو اس طرح باہر نکال دیتے تھے گویا طالب علم کو منہ چڑھا رہے ہیں۔ ہمارے ایک اور استاد غلام جیلانی صاحب تھے۔ وہ تو گویا ہم لوگوں کے نہایت بے تکلف دوست تھے۔ ان کی کمزوریاں ہم خود ان سے کہہ دیتے تھے۔ مگر وہ کمزوریاں اس قدر زیادہ تھیں کہ وہ بیچارے ان کی اصلاح سے اس عمر میں قاصر تھے۔ ہمارے فارسی کے استاد مولوی فضل حسن صاحب کے متعلق ہم لوگوں کی رائے یہ تھی کہ ان بیچارے کی وفات کسی دن کلاس ہی میں واقع ہوگی۔ اس لئے کہ ان کے پڑھانے کے طریقے اور ورزش میں بہت کم فرق تھا جس کی حالت یہ تھی کہ بالکل چڑیا نظر آتے تھے ناک کی پھننگی پر رکھی ہوئی عینک۔ بغل میں کتابوں کا ڈھیر اور برآمدہ میں ٹہل رہے ہیں۔ اس انتظار میں کہ گھنٹہ بجے اور درجہ میں تشریف لے آئیں۔ پھر کیا مجال کہ ایک منٹ بھی ضائع ہو، آتے ہی نعرہ بلند کیا۔ سائنس کے لڑکو سائنس میں جاؤ فارسی والو آگے بڑھو۔ صفحہ اکتیس نثر۔ خواہندۂ مغربی در صف بزازانِ حلب می گفت کہ اے خداوندانِ نعمت اگر شمارا انصاف بودے و مارا قناعت۔ قناعت کیا سمجھے۔ مارا قناعت۔ رسم سوال از جہان برخاستے پھر سے سنئے" اور یہ سب

کچھ ایک سانس میں، گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ اس وقت بیچارے کا کم سے کم ایک پھیپھڑہ حلق میں ضرور ہے بڈھے آدمی، کمزوری کا حال یہ کہ الفاظ کے تمام جسم کو زبان بنا کر بولتے تھے اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ بس اس کے بعد ان کو کچھ نہیں کہنا ہے مگر وہ مدتوں اسی شان سے پڑھاتے رہے۔ نتیجہ یہ کہ آخر ہم لوگ جو پہلے ان کی زندگی سے مایوس تھے، اب موت سے مایوس ہو گئے۔ اور طے ہو گیا کہ یہ مریں گے نہیں۔ بلکہ سوکھ جائیں گے۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ حسین آباد ہائی اسکول میں اتنا محنتی اور حلال کی روٹی کھانے والا اور کوئی استاد نہ تھا۔ جب ان کو یہ اطلاع ہوئی کہ ہم ان کی نقل بھی اتارتے ہیں تو نقل سننے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ اور جب نقل سنی تو فرمایا کہ نقل مطابق اصل ضرور ہے مگر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ع

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

باقی استادوں میں سے کچھ ہنس کر چپ ہو رہے کچھ برا مان گئے۔ اور جہاں تک ہم کو یاد پڑتا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب نے یا خان صاحب سید امیر احمد صاحب نے جو آج کل ہیڈ ماسٹر ہیں اور اس وقت اسسٹنٹ ماسٹر تھے۔ یہ فرمایا تھا کہ نقل اتارنا بڑی ذہانت کا کام ہے۔

سوشل سکریٹری

اسی زمانہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں Students own club

کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی محنت سے اس کلب کے لئے قواعد وضوابط وغیرہ مرتب کر کے عہدیداروں کا انتخاب بھی اس کو نہ کہنا چاہیئے بلکہ عہدیدار خود مقرر کئے ہم کو اس کا سوشل سکریٹری بنا دیا گیا اور ہمارے ہی زیر اہتمام ایک بہت بڑا جلسہ کیا گیا یہ جلسہ تقسیم انعامات کی قسم کی ایک چیز تھا۔ یہ جلسہ ہم نے ایک سب کمیٹی کی مدد سے اپنے انتظامات کے ماتحت بیحد کامیاب بنا دیا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمارے انتظامات کی بے حد تعریف کی سوائے اس ایک بد انتظامی کے کہ مٹھائی کم پڑ گئی تھی مگر وہ کم پڑنا ہی چاہئے تھی۔ اس لئے کہ شروع سے ہی کمیٹی کے ممبران بلا تکلف کا ذائقہ چکھنے میں مصروف تھے۔ کہ کہیں کوئی چیز بد مزہ نہ ہو جائے بلکہ دس بیس رہ گئے تو ہم سب نے مل کر محض یہ اندازہ کرنے کے لئے کھائے تھے کہ ایک آدمی کو جب یہ حصہ ملے گا تو اس کو کھا کر اس کے پیٹ کا کتنا حصہ بھرے گا۔

بدرالحسن

حسین آباد ہائی اسکول میں ہمارے ایک ہم جماعت بدرالحسن تھے۔ ان حضرت کو ہم سب نے اتفاق رائے سے اپنا سالار اعظم مان لیا تھا جیسے ذات شریف تھے۔ یہ بزرگ بھی۔ ہم لوگ ان کو بدو بدو کہا کرتے تھے اور واقعی بدوؤں کی سی شکل بھی تھی معلوم یہ ہوتا تھا کہ ابھی عرب کے صحرا سے اونٹ چھوڑ کر یا کسی قافلہ کو لوٹ کر آیا ہے۔ یہ حضرت کبھی اسکول میں پڑھنے نہیں آتے تھے

بلکہ اسکول کی غیر تعلیمی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے ذمہ دار تھے جو سوجھتی تھی نئی سوجھتی تھی۔ اسکول میں اعلان ہوا کہ کل جلسہ تقسیم انعامات کے لیے وزیر تعلیم صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ طالب علموں کو چاہیے کہ ذرا صاف کپڑے پہن کر آئیں۔ اور تمیز سے رہیں۔ بدر نے اسی وقت جا کر دوسرے دن کے لیے اہتمام شروع کر دیئے۔ اور دوسرے دن جو ہم لوگوں نے ان کو دیکھا ہے تو کسی کی ہنسی ضبط نہ ہوتی تھی۔ سر استرے سے منڈوایا تھا اس پر تیل نہایت اہتمام سے چپڑا تھا۔ اور پہنے ہوئے سوٹ جس وقت ایک انعام کے لیے آپ کو آواز دی گئی ہے آپ نہایت متانت کے ساتھ اسی سج دھج سے وزیر تعلیم صاحب کے سامنے گئے۔ انعام لیا۔ اور تالیوں کی گونج میں واپس آگئے مگر اس وقت استادوں کا یہ حال تھا کہ ہنسی روکنے کے لیے منہ پر رومال رکھے ہوئے تھے۔ اور ہیڈ ماسٹر کے نتھنوں کے پھلاؤ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی زبردستی سنجیدگی کی اداکاری فرما رہے ہیں۔ اس قسم کی ایک دو نہیں ہزاروں حرکتیں وہ حضرت روز فرمایا کرتے تھے۔ جماعت میں استادوں سے ایک سے ایک لاجواب قسم کا سوال کر بیٹھتے تھے۔ اور استادوں کو جان چھڑانا مشکل ہو جاتی تھی۔ ایک دن میری بیماری کی اطلاع پا کر عیادت کے لیے تشریف لائے دیر تک بیٹھے رہے تب جانے لگے تو ٹھیک ٹھاک تھے۔ صبح کو اطلاع ملی کہ بدرو کا انتقال ہو گیا کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ دل نے کہا کہ اس میں بھی کوئی شرارت ہے مگر ایسی خبر پا کر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ہم بستر علالت پر دراز رہتے اسی حالت میں ان کے گھر گئے معلوم ہوا کہ شرارت نہیں واقعی یہ حادثہ ہوا ہے۔ رات کو

بخار آیا اور صبح ہوتے ہوتے ختم، اب ایک سوال یہ تھا کہ اس دن
شہر میں ہڑتال تھی کہیں کفن دستیاب نہ ہوتا تھا۔ مرحوم کے نانا صاحب
نے فرمایا کہ میرے پاس کعبہ شریف کا کفن رکھا ہوا ہے۔ مگر میں اسے اس لیے
نہیں دے سکتا کہ پھر مجھے نہ جانے میسر ہو یا نہ ہو۔ ان کی عقیدت کا درجہ
خواہ کیسا ہی بلند ہو مگر اس موقع پر کفن دے دینا بھی اتنے ہی ثواب کا کام تھا
جسے وہ کسی استدلال کے باوجود نہ سمجھ سکے آخر ہمیں سے ایک صاحب نے
ایک بزاز کی دکان کھلوا کر کفن حاصل کیا۔ اور اپنے اسکول اور اپنی جماعت کی
کی زندگی کو دفن کر آئے۔ بڑوں کی موت کا میری صحت پر بہت برا اثر پڑا اور معمولی
سی بیماری اس حادثہ کے ماتحت طول کھینچ گئی

عشق

اسی زمانہ میں یا یہ یاد نہیں کہ اس علالت سے پہلے یا اس کے بعد بہرصورت
اسی دور میں کیوپڈ کو بھی اپنا تختۂ مشق بنانے کے لیے ہمارا ہی انتخاب کرنا
پڑا۔ یوں تو بہت دنوں سے اپنی ایک قریبی عزیزہ کے متعلق دل میں کچھ عجیب
جذبات نشوونما پا رہے تھے۔ مگر اب اس کا اعلان بھی ہو گیا اور ہم نے اپنے
بھائی جان ارشد تھانوی صاحب سے جو اب ہمارے بہنوئی بھی بن چکے
تھے۔ اپنے اس انتخاب کا ذکر کر دیا۔ دراصل یہ عزیزہ ان ہی کی ہمشیرہ
عزیزہ تھیں۔ ارشد صاحب نے اس سلسلہ میں کوئی گہری دلچسپی نہ لی اس
لیے کہ وہ اس انتخاب کی سنجیدگی کے بڑے قائل نہ تھے۔ اور انہوں نے کبھی ہمارا

طفلانہ اور وقتی جذبہ سمجھ رہے تھے۔ مگر یہاں حالات روز بروز شدید ہو رہے تھے۔ اس لڑکی کی بیماری کا حال تو ہم کو معلوم نہیں مگر ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ ہو نہ ہو یہ جذبہ جو ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے اسی کو عشق کہتے ہیں اور اگر اس کے نتائج حسبِ دلخواہ نہ نکلے تو معلوم نہیں ہمارا کیا حشر ہوگا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ ہمارے اکثر ساتھیوں کو عشق ہو چکا تھا۔ وہ اپنے قصے برابر سناتے تھے۔ کوئی اپنی محبوبہ کا خط دکھاتا تھا کہ وہ کس طرح ان حضرت کے لیے تڑپ رہی ہے۔ کوئی اپنا خط سناتا تھا کہ میں اپنی منگیتر یا محبوبہ کو کیا لکھ رہا ہوں کوئی صاحب ایک خشک پھول لیے پھرتے تھے۔ کہ یہ پھول میری محبوبہ نے میرے کوٹ میں اپنے ہاتھ سے محبت کی یادگار کے طور پر لگایا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی تو اس حد تک عاشق تھے کہ وہ ایک نہایت مکروہ صورت کی مدقوق سی بلی پالے ہوئے تھے۔ اور جب ان سے اس ذوقِ سلیم کی تفصیل دریافت کی گئی۔ تو پتہ چلا کہ یہ بلی ان کی محبوبہ دلنواز نے پالی تھی۔ مگر جب وہ پڑوس والا مکان چھوڑ کر چلی گئی تو بلی میرے سپرد کر گئیں۔ کہ اس بلی سے سگِ لیلیٰ کا لطف حاصل کرنا۔ ان حالات میں ہمارے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہم بے عشق کیے رہ جاتے۔ نست ہم سے طبیعت کو جو مناسبت اور دل کو جو لگاؤ تھا وہ تو خیر اپنی جگہ پر ایک نہایت شریفانہ جذبہ تھا۔ مگر اس نے عشق کی جو صورت اختیار کی تھی وہ یقیناً فیشن کے ماتحت تھی۔ چنانچہ ہمارے اس شغل کی اطلاع بھی ہمارے دوستوں کو تھی۔ اور وہ ہمارے عشق سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اس لیے کہ ہم لوگ آپس میں مل کر آہ و زاریاں کیا کرتے تھے۔ وہ

ہائے گل پکارتے تھے اور ہم اپنے دل۔ ہماری بہنت ہم بیچاری کا انتقال ہو چکا ہے، خدا انہیں ہم کو معاف کرے اور ان کی روح کو بھی نہ شرمائے۔ اس لئے کہ اس میں ان کا تو کوئی قصور ہی نہیں تھا یہ حرکتیں تو سب ہماری تھیں اپنے دوستوں کے سامنے عشق کی دوڑ میں ہم بھی کسی سے پیچھے رہنا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم نے بھی خط بگاڑ بگاڑ کر ع

ان کی طرف سے آپ لکھے گئے خط جواب ہیں

اور ان خطوں کو اپنے ان ہمراز دوستوں کو دکھاتے تھے جن کے مکتوب محبت ہم دیکھ چکے تھے۔ اور دیکھا کرتے تھے۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ ہم بھی اس سلسلہ میں سرخرو ہو سکیں اور ہمارے متعلق بھی ہمارے دوست سمجھ سکیں کہ ہم بھی وہ ہیں جن پر خوبصورت لڑکیاں فریفتہ ہو سکتی ہیں۔

وہی خوبصورت لڑکی فریفتہ ہو سکتی تھی جس کی بصارت میں کوئی خطرناک قسم کا نقص ہوتا۔ اور وہ بیچاری لڑکی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس کی فریفتگی کے دستاویزی ثبوت اس کے چچا زاد بھائی اور اس سے شادی کے امیدوار صاحب مرتب فرما رہے ہیں اس کو زیادہ سے زیادہ یہ اطلاع تھی کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری شادی اس کے ساتھ ہو جائے ادھر تو ہم یہ جعلی خطوط بنایا کرتے تھے اور ادھر اپنی بڑی بہن خاتون ارشد صاحبہ اور بھائی جان ارشد تھانوی سے یہ ضد تھی کہ بس شادی کرا ہی دیجئے یہاں تک کہ یہ اطلاع والد صاحب کو بھی ہو گئی اور انہوں نے قطعی انکار کر دیا کہ یہ نسبت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مگر جن کو عشق صادق ہوتا ہے

وہ بھلا ان دھمکیوں میں آتے ہیں۔ ہم تو طے کیے بیٹھے تھے کہ شادی ہوگی اور وہیں ہوگی ورنہ کبھی نہ ہوگی۔ اور کہیں نہ ہوگی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ والدہ صاحبہ نے سمجھایا اور ہم نے جی کڑا کر کے صاف کہہ دیا کہ اگر وہاں شادی نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ اب تو ہمت بڑھ چکی تھی اور عاشق کو ڈر بھی کس بات کا ہو سکتا تھا۔ مصائب کے لیے اگر تیار نہ ہوتے، اختلافات سے اگر مرعوب ہی ہو جاتے تو عشق ہی کیوں کرتے۔ آخر والد صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا کہ اگر میری شادی وہاں نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ والد صاحب نے اپنا ریوالور بمع چھ کارتوس بھیجے اور ملازم کہہ دیا کہ جا کر چھوٹے میاں کو دے آؤ اور کہنا کہ بسم اللہ۔ اس جواب کی امید بھی نہ تھی۔ ریوالور دیکھ کر تو دم ہی تو نکل گیا ادھر والدہ صاحبہ نے سر پیٹ لیا کہ کیا غضب کیا تم نے وہ اپنی جان دے دے گا مگر پولیس کے منجھے ہوئے ان تجربہ کار بزرگ نے نہایت بے پروائی سے فرمایا کہ تم چپکی بیٹھی رہو۔ جو زبان سے خودکشی کہہ دے، وہ خودکشی کبھی کر ہی نہیں سکتا اور اگر خودکشی کر لے تو سمجھ لینا کہ ٹھکانے لگا۔ اس قسم کے لوگ یا تو بعد میں سدھر جاتے ہیں، ورنہ قتل کے جرم میں پھانسی پایا کرتے ہیں ادھر ہم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریوالور اٹھایا ایک مرتبہ دل مضبوط کر کے ریوالور کی نال کنپٹی پہ رکھ کر کلمہ پڑھا لبلبی کو ٹٹولا اور پھر کیوپڈ صاحب سے کہا کہ آپ ذرا اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر لیتے تو اچھا تھا چنانچہ وہ راضی ہو گئے۔ ریوالور کنپٹی سے ہٹ کر میز پر آ گیا۔ اور ہم کو محسوس ہو گیا کہ عشق اسی وقت تک دلچسپ مشغلہ ہے جب تک جان جوکھوں کا سوال پیدا نہ ہوا ریوالور والد

صاحب کے ہاتھوں میں اور ہم ان کے قدموں میں نظر آئے رہ گیا دل وہ اب تک لکھنؤ اور بھوپال کے درمیان گو مگو کے عالم میں تھا مگر رفتہ رفتہ جھانسی تک آیا پھر دہلی پھر کانپور۔ پھر اناؤ اور آخر لکھنؤ۔ ان عزیزہ کی شادی کچھ دن بعد ان کے ایک ننہالی عزیز کے ساتھ ہو گئی جو ہم سے کہیں بہتر تھے۔ مگر شادی کے کچھ ہی دن بعد وہ بیچاری نمونیہ میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جہاں محبت بھی جنگلی جانوروں کی طرح ریوالور سے بھاگ جاتی ہے۔ مرنے کی دھمکی کس نے دی اور مرا کون، واقعی عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد ہوتا ہے۔ اور مردانگی پہلد ششی ڈالنے کی غالباً ہمیں اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ماسٹر بخشش احمد

اس عشق سے فارغ ہو کر پھر تعلیم کی طرف متوجہ ہونا تھا اس لئے کہ عاشق تو گویا ضمنی طور پر ہو گئے تھے۔ ورنہ تھے تو طالب علم ہی۔ والد صاحب اس واقعہ کے بعد ذرا چوکنا ہو گئے تھے۔ اور ان کو اب یہ پتہ چل چکا تھا کہ صاحبزادے میں بغاوت کے پورے آثار موجود ہیں۔ اگر ذرا بھی ان کی طرف سے غفلت برتی گئی تو یہ حضرت نہ جانے کیا گل کھلا بیٹھیں گے۔ لہٰذا ان کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو گھر ہی پر رہ کر ہماری تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بے بی آسٹن قسم کے بزرگ تشریف لائے منا سا قد منہ پر چھپر نما مونچھیں۔ ہمارا ایک جوتا ان کے دونوں پیروں میں آ سکتا

ہوا، اور ہماری شیروانی پہننے کے بعد ان کو پاجامے کی ضرورت بھی نہ رہتی سمجھے بیٹھے تھے کہ والد صاحب یہ جاندار گیند ہم سے خوش ہو کر ہمارے کھیلنے کے لیے لائے ہیں مگر پتہ چلا کہ یہ حضرت ہمارے اتالیق مقرر ہوئے ہیں۔ جونپور کے رہنے والے ہیں۔ اسم مبارک بخشش احمد ہے۔ غریب خانہ ہی پر قیام فرمائیں گے اور چوبیس گھنٹے ہم پر نازل رہیں گے۔ چنانچہ ان بزرگ نے ہم کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اور ہماری تعلیم اور تربیت شروع کر دی۔ آدمی مختصر سے ضرور تھے مگر اس چھوٹے سے قد میں بلا کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ بڑے داؤں پیچ اور کاٹ چھانٹ کے بزرگ تھے۔ بیحد باتونی۔ شروع میں آپ نے اپنی ذات سے دلچسپی پیدا کرنے کے سامان کیے۔ ٹینس کھیلنے کا انتظام کیا۔ ریکٹ آئے۔ جال آیا۔ گیند آئے۔ لان درست ہوا۔ اور ہم نے باقاعدہ ٹینس شروع کر دی ماسٹر صاحب سے دوستی ہی ہو گئی تھی اور ہم ان کو پسند کرنے لگے تھے جہاں تک پڑھانے کا سوال ہے اس پر وہ بہت زیادہ زور نہ دیتے تھے اور پڑھاتے تھے تو وہ بھی نہایت کھلنڈرے پن کے ساتھ تاکہ سبق کوئی قابل نفرت چیز نہ بنے بلکہ قابل قبول ہو سکے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ طریقہ بھی بہت اچھا تھا کہ ہماری ہر معمولی سے معمولی صلاحیت کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ اور کمزوریوں کو جہاں تک ہوتا تھا دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ لڑکا بلا کا ذہین ہے۔ اس کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ یہ کوئی چیز ہوتا۔ ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوقین بنا رہا تھا۔ خوشامد پسندی تو خیر فطرت میں تھی ہی۔ اس دکھتی ہوئی رگ پر ماسٹر بخشش احمد کی نباضی نے ہاتھ رکھ دیا اور ا

وہ بے پرواہ طالب علم جو اب تک تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھا کرتا تھا تعلیم کو اپنا دلچسپ ترین مشغلہ سمجھنے لگا۔ اب کے علاوہ اب ایک پروگرام بن گیا تھا۔ اس وقت سو کر اٹھنا۔ اس وقت ناشتہ کرنا۔ اس وقت غپ شپ، اس وقت اسکول۔ اس وقت کھیل۔ گویا زندگی ایک باقاعدگی کے ساتھ ان ماسٹر صاحب نے شروع کرادی، وہ صرف ہماری کتابوں کے ذمہ دار نہ تھے۔ بلکہ ہمارے لباس پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ ہماری غذا کی بھی ان کو فکر ہوتی تھی۔ ہمارے کھیل کود کے انتظام بھی ان کے سر تھے۔ والد صاحب کو اب اطمینان تھا۔ کہ صاحبزادے ایک راستہ پر لگ گئے ہیں۔ اور اب کسی نہ کسی دن منزل تک پہونچ ہی جائیں گے۔ ماسٹر بخشش احمد صاحب اس حد تک ہمارے دوست ہو چکے تھے۔ کہ ان کو ہمارے گذشتہ عشق تک کی اطلاع تھی۔ اور وہ بھی کبھی کبھی۔ اس سلسلہ میں بات بھی کیا کرتے تھے۔ اپنے عشق کی کہانیاں سناتے تھے اور اس طرح ہم پر یہ واضح کرتے کہ یہ دراصل عشق نہیں بلکہ عشق کا ایک خامکارانہ دھوکا ہوتا ہے۔ جس کو انسان یاد تو ہمیشہ رکھتا ہے، مگر یہ یاد کبھی تڑپاتی نہیں۔ بلکہ یونہی ذہن میں ایک واقعہ کے طور پر محفوظ رہ جاتی ہے۔ جس پر انسان بعد میں، ہنستا بھی ہے۔ اور کبھی کبھی اس سے سبق بھی لیتا ہے۔ ماسٹر صاحب شاعر تو نہیں تھے۔ مگر شاعری کا شوق بہت تھا۔ اکثر شعراء کا کلام بڑا مزا لے لے کر پڑھتے تھے۔ اور ان کے اس مزا لینے سے ہم کو بھی لطف آتا تھا۔ شعراء کو اس قدر مزیدار چیز ہم نے اب تک کبھی نہ سمجھا تھا۔ اب شعر میں ہم کو بھی مزا آنے لگا تھا اور شعراء کا کلام ہم بھی بہت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ اور اس سے لطف

لیتے تھے۔ ایک دن ہم نے خود بھی شعر کہنے کی کوشش کی۔ اور تھوڑی دیر کی فکر کے بعد دو شعر کہے ؎

خدا اپنی خدائی دے کے بس ان کو مجھے دیدے
میں یہ سمجھوں گا اس نے اک خدائی مجھکو دیڈالی
مری تخریب سے تعمیر کے پہلو بھی نکلیں گے!
مجھے آراستہ کردے گی اک دن ان کی پامالی

ماسٹر صاحب کو یہ شعر سنائے تو وہ اچھل پڑے۔ کسی طرح ان کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ شعر ہم نے کہے ہیں، وہ اس کو سرقہ سمجھ رہے تھے۔ مگر جب ان کو یقین ہو گیا تو ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوئی۔ اور ایک دم ان کو احساس ہوا کہ اس لڑکے میں پوری شاعرانہ صلاحیت موجود ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمارا حوصلہ پست کرتے ہم کو انھوں نے پورا یقین دلایا کہ تم شاعر ہو، شاعر کبھی بنتا نہیں۔ بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ادھر ہم کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ چور کبھی بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ شعر واقعی ہمارے نہیں تھے۔ ایک بہت پرانے رسالے سے نقل کر لئے تھے۔ مگر اسی واقعہ نے دراصل ہم کو شاعر بنانا شروع کر دیا

شوکت تھانوی

ان اشعار کو سننے کے بعد ماسٹر صاحب نے ہمارے لئے تخلص کی جستجو شروع کر دی۔ آخر ہم نے خود ان سے کہا کہ ہمارا تخلص شوکت رکھ دیجئے۔ کہنے لگے۔ بہت اچھا ہے یہی سہی۔ چنانچہ اب ہم گھریلو طور پر شوکت ہو گئے۔ اور چونکہ ارشد تھانوی

کی وجہ سے یہ معلوم تھا کہ ہم تھانوی بھی لگا سکتے ہیں۔ لہذا شوکت تھانوی ہوگئے، پرانے رسالوں سے شعر نقل کرنے کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ مگر اب ایک بات پیدا ہوگئی تھی کہ طبیعت میں شعر سے دلچسپی اور موزونیت کا احساس خود ہم کو ہونے لگا تھا ایک آدھ مصرع کبھی کبھی خود بھی موزوں کر لیتے تھے۔ مگر وہ ہوتا تھا ایسا تھرڈ کلاس کہ اس کو سنانے یا اپنا کہنے کو دل نہ چاہتا تھا ہمارے شاعر ہونے کی اطلاع ہمارے ہم جماعتوں کو ہو چکی تھی اور ہم ان کو اپنا دی کلام جھوم جھوم کر نہایت خوش آوازی کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ اور ان پر اپنا رعب جماتے تھے۔ ہمارے اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی صاحب بھی ہم کو نہایت قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے اور واقعی اسی طرح چوری کرنے ہی کے طفیل میں کم سے کم استعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ اور باقی مضامین تو خیر جیسے کچھ بھی تھے۔ ہم کو خوب معلوم ہے کہ اردو میں ہمیشہ اول نمبر پاس ہوتے رہے اور ہماری اردو کی قابلیت ہمارے استادوں اور ممتحنوں نے ہمیشہ تسلیم کی۔ مگر ایک دن ہماری شاعری کا بھانڈا خوب پھوٹا ہم نے ایک تازہ غزل اپنے احباب کو سنائی اور وہ ہمارے اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی تک پہونچی۔ خوب خوب ہم کو داد ملی۔ اور مولوی حفاظت علی صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ اعتراف کیا کہ بھائی خدا کی دین ہے۔ شاعر تلمیذ الرحمان ہوتا ہے۔ اور شاعری کے لئے کسی عمر یا قابلیت کی قید نہیں وہ جس کو نواز دے۔ مگر دوسرے دن ہمارے ایک ہم جماعت محمد ایوب حسن کمبخت جو آج کل اسی لکھنؤ میں سٹی انسپکٹر پولیس ہیں نہ جانے کہاں سے وہ رسالہ لے آئے جس میں وہ غزل چھپی تھی اور وہ رسالہ مولوی حفاظت علی صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اس کو دیکھا

اور بہت ہنسے۔ لڑکوں نے ہم کو نکو بنا لیا۔ اور ہم اب شاعر تو شاعر ایک معمولی انسان کی حیثیت سے بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھے۔ مگر اس زمانہ میں غالباً غیرت داری بھی یوں ہی سی تھی۔ کچھ دن تک اس کا اثر رہا۔ دوستوں نے مذاق اڑائے۔ استادوں نے ذلیل کرنے کی پوری کوشش کی مگر ہم ذلیل ہونے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اور ہر چند کہ ہمارا ستارہ گردش میں آچکا تھا مگر کچھ ہی دن کے بعد حالات اپنی معمولی رفتار پر آگئے۔ البتہ اب میری شاعری کا سکہ کھوٹا ثابت ہو چکا تھا۔ اور پھر ہم کبھی یہ جرأت نہ کر سکے کہ اپنے کسی ہم جماعت کو اپنا کوئی شعر سنائیں خواہ وہ ہمارا ہی کیوں نہ ہو۔

پہلی غزل

چوری کھلنے کے اس واقعہ کے بعد ہم کو واقعی عبرت حاصل ہوئی اور اس سلسلہ میں ہم ایوب صاحب کے ہمیشہ کے لیے شکر گزار رہیں گے کہ اس شرارت کے پردہ میں ہم سے بہت بڑی دوستی کی۔ چنانچہ ہم نے پھر کبھی کسی شاعر کا شعر نقل نہیں کیا۔ اور خود شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے۔ معلوم یہ ہوا کہ شعر کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ گھنٹوں غور کر کے ایک مصرعہ کہا بھی تو پتہ چلا کہ اس میں یا تو کچھ گھٹ گیا ہے۔ یا بڑھ گیا ہے۔ اور گھنٹہ بھر اس کی کتر بیونت کی راتوں کو بیٹھے مصرعے لکھ رہے ہیں۔ اور کاٹ رہے ہیں۔ اور والدین یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا ہونہار امتحان کی شدید تیاریاں کر رہا ہے۔ اسی زمانہ میں بھائی جان ارشد تھانوی صاحب تشریف لائے اور ان کو ہمارے آتالیق

ماسٹر بخشش احمد صاحب نے ہماری شاعرانہ صلاحیت کی اطلاع دی تو ان کو کسی طرح یقین نہ آیا آپ نے امتحان لینے کے لیے ہم کو ایک مصرعہ دیا ؎

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

اور فرمایا کہ اس پر مصرعہ لگاؤ۔ ہم نے تھوڑی دیر میں اس پہ مصرعہ تو نہیں لگایا بلکہ اپنے مصرعہ پر اس کو لگا کر مطلع کر دیا ؎

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
غمناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

بھائی جان نے جو یہ مطلع دیکھا ہے تو میں ان کی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ میری کسی صلاحیت پر میرے عزیزوں میں سے کوئی کبھی اتنا خوش نہ ہوا تھا اور خود میں خوش تھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ بھائی جان نے یہ مطلع والد صاحب کو بھی سنایا مگر وہ سنی ان سنی کر کے ٹال گئے۔ غزل کی چوری کھلنے سے جو دھچکا پہنچا تھا اس کی تلافی ہو گئی اور شعر کہنے کی ایک نئی امنگ پیدا ہو گئی۔ اور آخر کچھ دن بعد ہم نے ایک پوری غزل کہہ کر لکھنؤ کے ایک رسالے کو اس خوشامد کے ساتھ بھیجی کہ اس کو چھاپ دیا جائے۔ امید تو نہیں تھی کہ چھپ جائے گی۔ مگر ایک دن ڈاک میں ہمارے نام ایک رسالہ آیا جس پر پتہ لکھا ہوا تھا:

"شیخ محمد عمر صاحب شوکت تھانوی" کھول کر دیکھا تو وہی رسالہ" ہاں رسالہ کا نام بھی سن لیجیے "ترچھی نظر" کیا پاکیزہ اسم مبارک تھا۔ اس رسالہ کا بھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ "ترچھی نظر بلدہ" لکھنؤ" یہ پورا گویا اس کا تاریخی نام تھا یہ رسالہ حاجی محمد اصطفےٰ خاں صاحب اصطفا مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجرانِ عطر

کے زیر اہتمام نکلتا تھا اور اس کے ایڈیٹر گویا مولوی برکات احمد صاحب تھے۔ رسالہ کو الٹ کر دیکھا تو فہرست مضامین ہمارے نام سے جگمگا رہی تھی عجیب اضطراب کے عالم میں رسالہ کے صفحات الٹے پلٹے اور اپنی غزل اور غزل کے اوپر اپنا نام جلی حروف میں دیکھ کر ایک دم ایسا محسوس ہوا کہ گویا زندگی میں کوئی بہت بڑا انقلاب آگیا ہے۔ بار بار غزل کو پڑھتے تھے اپنا نام پڑھتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے اس روز ہمارے خون میں نمایاں اضافہ ہوا ہوگا۔ آخر ہم نے دوسروں پر اپنی شاعری کا سکہ جمانے کے لئے رسالہ کا وہی صفحہ کھول کر گھر میں ایک ایسی جگہ رکھ دیا کہ ہر شخص کی اس پر نظر پڑ سکے۔ اور پھر اس طرح دور بیٹھ کر اس کی نگرانی کرنے لگے جیسے کوئی چوہے دان میں روٹی لگا کر چوہوں کے پھنسنے کا انتظار کرتا ہے یہ بھی عجب اتفاق ہے۔ کہ اس دن رسالہ پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ اور ہمارا انتظار بالکل بیکار گیا۔ دوسرے دن ہم نے رسالہ کی جگہ بدل دی۔ اور پھر کانٹے میں چارہ لگا کر مچھلی پھانسنے کے انداز سے دور جا بیٹھے۔ سب سے پہلے والد صاحب کی نظر رسالہ پر پڑی اٹھا کر اسے دیکھا۔ دیکھ کر کچھ ٹھٹکے اور پھر تیقن کے لئے عینک لگا کر بغور اسے پڑھا اور پھر نہایت تشویش کے ساتھ رسالہ کو میز پر رکھ کر والدہ صاحبہ کو آواز دی۔

„ارے میں نے کہا سنتی ہو"

„آواز آئی آرہی ہوں ہاں!"

جواب دیا „اجی ہاں نہیں ذرا یہاں آجاؤ"

والدہ صاحبہ تشریف لائیں تو آپ نے اطمینان سے بیٹھ کر کہا۔

"یہ آپ کے صاحبزادے کا کلام ایک رسالہ میں چھپا ہے"
والدہ صاحبہ نے یقین نہ کرتے ہوئے نون کو کھینچ کر کہا۔ "ہوں"
والد صاحب نے رسالہ دکھاتے ہوئے کہا۔ دیکھ لو نا۔ فرماتے ہیں صاحبزادے کہ ؎

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

سوال یہ ہے کہ آخر یہ جاتے ہی کیوں ہیں۔ اور کس سے پوچھ کر جاتے ہیں۔"
والدہ صاحبہ بیچاری نہایت معصوم سمجھیں کہ لڑکے کی کوئی چوری پکڑی گئی ہے گھبرا کر بولیں: "مجھے تو جانے آنے کی کوئی خبر نہیں!"
والد صاحب ہنس دیئے۔ اور فرمایا۔ "شوق برا نہیں ہے مگر قبل از وقت ضرور ہے۔"

ہم دور بیٹھے یہ سب باتیں سن رہے تھے۔ اور اندازہ کر رہے تھے کہ والد صاحب اگرچہ اپنی خوشی دبلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر در اصل ہیں بہت خوش۔ بار بار رسالہ کو دیکھنا اور پھر رکھ دینا۔ بلا وجہ تو ہو نہیں سکتا۔ مگر اس سلسلہ میں والد صاحب نے ہم کو کچھ نہ کہا۔ ہماری یہ غزل بہت سی خوبیوں کی آئینہ دار تھی۔ مثلاً ایک تو اس میں شعر ہی ایسے بلند تھے کہ ہم اپنے منہ سے کیا تعریف کریں۔ دوسرے عروض کے بڑے بڑے کمالات ان میں موجود تھے۔ مثلاً مقطع ملاحظہ ہو ؎

شفا پاتے ہوئے ان کو نہیں دیکھا کبھی شوکت
جو عشقِ مرضِ مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں۔

تخیل کی بلندی پر غور نہ کیجیے اور نہ اس طبی مسئلہ کو میڈیکل کونسل کے سامنے لانے کی فکر کیجیے کہ عشق کے بیمار شفایاب کیوں نہیں ہوتے۔ بلکہ اس میں لفظ ”مرض“ کے حسن کو ملاحظہ کیجیے کہ کس حسن سے نظم ہوا ہے۔ مرض بفتح اول و دوم سب ہی استعمال کرتے ہیں۔ مگر ”شاعر ترچھی نظر بلدہ لکھنؤ“ نے مرض کی رے کو یض بنا کر استعمال کیا ہے۔ یہ کمالات اب کہاں نظر آتے ہیں۔

بارود کو دیا سلائی

اس غزل کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تمام ادبی صلاحیتیں ایک مرتبہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں۔ اب غزل پر غزل کہنے لگے۔ اور ہلکے غزلوں سے ”ترچھی نظر“ کا دفتر پاٹ دیا۔ کبھی کبھی کوئی غزل چھپ جاتی تھی اور باقی ردی کی ٹوکری میں پہونچ جاتی ہوں گی۔ ترچھی نظر کا فائل ہم کو جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس لیے کہ اس میں ہمارا کلام چھپا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں ہماری واحد دلچسپی یہی ادبی انہماک تھا۔ غزلیں کہنے کے علاوہ ترچھی نظر کے افسانے پڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں۔ چنانچہ بہت ڈرتے ڈرتے ایک افسانہ لکھ کر ترچھی نظر کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ من و عن چھپ گیا گیا۔ دوسرا افسانہ، تیسرا افسانہ اور چوتھا افسانہ، ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا۔ لیجیے شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے۔ اور ہماری ادبی زندگی کا یہ بچپن نہایت طوفان خیز امنگوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔ رہ گیا پڑھنا لکھنا وہ یونہی برائے نام تھا۔ یہ تو سب دیکھتے تھے کہ آدھی آدھی رات تک ہم لکھ پڑھ رہے ہیں

مگر یہ کسی کو کیا معلوم کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں ہم نے اپنے اسکولی دوستوں کے لئے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کو خود نہایت خوشخط لکھتے تھے۔ اس میں کارٹون بھی کچھ نظمیں ہوتی تھیں۔ اور احباب پر چوٹیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ قلمی رسالہ حلقہ احباب میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ہر نمبر جو صرف ایک ہی ہوتا تھا احباب کے یہاں ایک ایک دن مہمان رہتا تھا اور گشت ختم کرکے پھر ہمارے پاس آجاتا تھا۔ پندرہ دن کے بعد دوسرا نمبر نکلتا تھا۔ مگر اس کے غالباً چار ہی پانچ نمبر نکل سکے۔ مختصر یہ کہ اسکول میں بھی یہی مشغلہ تھا اور گھر پر بھی یہی۔ والدین کچھ پڑھا رہے تھے۔ اور بلند اقبال کچھ پڑھ رہے تھے۔ من چہ می سرایم و تنبورہ من چی می سراید

شادی کا ذکر

تعلیم سے فراغت کا آخر کہاں تک انتظار کیا جاتا۔ ارمان بھری ماں بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ اور باپ کو جس طرح گھر کی کسی اور بات کی فکر نہ تھی اسی طرح بھولانے کی طرف سے بھی غافل تھے۔ آخر والدہ صاحبہ نے والد صاحب کو راضی کر لیا۔ کہ اب لڑکے کی شادی کر دی جائے۔ والد صاحب بھوپال والے واقعہ اور اس سلسلہ میں اپنی سختی کو بھولے نہ تھے۔ بلکہ اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حکم دے دیا کہ صاحبزادے دور اور نزدیک کے رشتہ داروں کے یہاں جائیں۔ اور خود یہ بتائیں کہ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سب ... پہلے ہم اپنے ننیہال ملاداں ضلع ہردوئی بھیجے گئے۔ وہاں ہماری خالہ تھیں۔ اور ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ ہمارے نزدیک انتخاب کا کوئی

سوال ہی نہ تھا۔ شادی کے لیے صرف لڑکی ہونی چاہئے تھی۔ جو بظاہر لولی لنگڑی وغیرہ نہ ہو۔ اور زیادہ تر مطلب تو اس بات سے تھا کہ ایک عورت اپنی تمام امیدیں ہم سے وابستہ کرکے ہم کو اپنا مالک و مختار بلکہ مجازی خدا بنا لے۔ شادی کا تصور اب نئی صورت میں ہمارے سامنے تھا کہ ایک عورت ہو۔ جو پھولوں میں لدی عطر میں بسی پاندان کھولے اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے ہمارے لیے پان بنا رہی ہے اور دوپٹہ کی اوٹ سے ہم کو دیکھتی جاتی ہے۔ اپنا سمجھ سمجھ کر اور اپنے کو ہماری سمجھا سمجھا کر لوگ اس عورت کو ہماری بیوی کہہ رہے ہیں۔ اس عورت کے گھر والے ہم کو دولہا میاں سمجھ رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ شادی سے زیادہ ہم کو اس اقتدار کی تمنا تھی۔ جو شوہر بن جانے کے بعد ایک انسان کو حاصل ہوتا ہے سسرال کی آؤ بھگت، سالیوں کا حسین مذاق، ساس اور سسر کی نیاز مندیاں سسرال کے دوسرے عزیزوں کی پرستاریاں ان سب کا انتظار تھا۔ چنانچہ ہم ملاوان گئے۔ اور ان میں سے ایک لڑکی پسند کر آئے اور مارے شیخی کے وہاں کہہ بھی آئے کہ ہم اس گھر کو اپنی سسرال بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ گھر آکر والدہ صاحبہ کو اپنے انتخاب کی اطلاع دی، والد صاحب نے سنا تو وہ اس فیصلہ سے مطمئن نہ ہوئے۔ بلکہ والدہ صاحبہ کو سمجھا دیا کہ یہ فیصلہ جلد بازی کا ہے ان حضرت کو باقی عزیزوں کے یہاں بھی بھیجا جائے۔ تا کہ یہ اطمینان سے کوئی فیصلہ کر لیں۔ لہٰذا ہم اب کی مرتبہ مین پوری بھیجے گئے۔ جہاں ہمارے ایک قریبی رشتہ کے خالہ زاد بھائی حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب مشن ہائی اسکول میں عربی اور فارسی کے

انچارج بھی تھے اور مطب بھی کرتے تھے۔ یہاں ہم جن صاحبزادی کو دیکھنے آئے تھے ان کو دیکھ کر آنکھوں کا نور اور دل کا سرور حاصل ہوا۔ طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اور ملاوان جا کر جو فیصلہ کیا تھا اس پر اپنے احمق ہونے کا سچے دل سے اعتراف کیا۔ ایک عجیب گڑیا سی لڑکی بھولا بھولا چہرہ، پیاری پیاری باتیں، پڑھی لکھی، نمازی، پرہیزگار، ہنس دے تو منہ سے پھول جھڑنے لگیں رو دے تو ۔ مگر روئے اس کی بلا۔ دور پار چھائیں پھوٹیں۔ مدعا مختصر یہ کہ دل نے کہا کہ، "اے میاں شوکت" اگر یہ بن جائے تو تمہاری دلہن تو کیا کہنا ہے زندگی سدھر جائے گی۔ گھر میں لکشمی آجائے گی۔ غریب آدمی کی لڑکی ہے۔ تم بھی غریب زادے ہو۔ مگر فرق دیکھو کہ تم تو صورت سے نقطے معلوم ہوتے ہو۔ اور یہ تخت طاؤس نظر آرہی ہے۔ کیا وقار ہے کیا تمکنت ہے معلوم ہوتا ہے کسی صوبہ کی گورنری کا چارج لے کر باورچی خانہ میں ماش کی دال دھو رہی ہے۔" آنکھوں کو دل کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق تھا اور دماغ ان تدابیر پر غور کر رہا تھا کہ کیونکر اس تتلی کو پکڑا جائے۔ ایک دن کے ارادے سے آئے تھے۔ مگر تین دن رہے اور تین دن اس طرح ختم ہو گئے۔ گویا تین چٹکیاں کوئی بجا دے۔ اپنی آنکھوں میں ان کو بسا کر اپنے دل میں ان کو چھپا کر لکھنؤ آگئے اور والدہ صاحبہ سے کہہ دیا کہ اب کی مرتبہ ہم نے واقعی آپ کے لئے بہو ڈھونڈ لی ہے۔ اور ہمارا یہ انتخاب آخری اور قطعی ہے، والدہ صاحبہ نے "ہم تو چل ہٹ" کہہ کر اس مرتبہ بھی معتبر نہ سمجھا۔ اس لئے کہ ہم ملاوان گئے وہاں سے آکر رضامندی ظاہر کر دی۔ مین پوری گئے وہاں سے آکر اپنی پسند کا اظہار کر دیا۔ آخر وہ بیچاری ہماری کس پسند کو قابلِ اعتبار سمجھیں مگر کچھ دن تک جب ہم کو اس

سلسلہ میں مستقل مزاج پایا اور ہماری پسند کے علاوہ ایک خاص بے قراری کا اندازہ کیا تو والد صاحب سے کہہ کر ہمارا باقاعدہ پیغام مین پوری بھیجدیا گیا وہاں سے جواب آگیا۔ کہ شادی میں تو کوئی عذر نہ ہوتا مگر پہلے بڑی لڑکی کا عقد ہو جائے اس کے بعد منجھلی کی نسبت پر غور کیا جائے گا۔ دوسرے لڑکا کم سے کم انٹرنس تو پاس ہو جائے۔

داڑھی

شادی کے سلسلے میں تو ہمارے بزرگ خط و کتابت کرتے رہے ادھر ہم اپنے ادبی اور برائے نام تعلیمی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ اس زمانہ میں تحریک ترکِ موالات کا بہت زور تھا۔ اسکولوں کے بائیکاٹ ہو رہے تھے۔ ہمارے اسکول میں بھی اس تحریک نے زور پکڑا۔ مگر خیر تعلیم تو ہم کیا چھوڑتے مگر کچھ نہ کچھ تو چھوڑنا چاہیے ہی تھا۔ لہذا ہم نے معلوم نہیں کس اثر کے ماتحت داڑھی چھوڑ دی۔ سر کے انگریزی بال خشخشی کرالیے۔ گاڑھے کے لمبے لمبے کرتے بنوالئے۔ گاڑھے کے پاجامے اور گاڑھے کی ٹوپی۔ پیر میں خاص گنوارو جوتا اور اسی سج دھج سے اسکول جانے لگے۔ کچھ دن تک لوگوں کو تشویش رہی کہ شاید دماغ پر کوئی ناگوار اثر پڑ گیا ہے پھر لوگوں نے ہنسنا شروع کردیا مگر یہاں

گھٹا کی عقل اور داڑھی بڑھا کی

تھوڑے ہی دنوں میں اچھی خاصی نورانی داڑھی چہرے پر لہلہانے لگی ہم کو اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ انقلاب سیاسی ماحول کے ماتحت ضرور ہوا تھا مگر اس

کا کسی سیاسی دلچسپی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جو کچھ بھی ہوا۔ اسی وضع قطع کے ساتھ ایک سال کا زمانہ گذرا پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پر آنے لگے کھدر کا کرتا چھوڑا قمیص پہنی شیروانی کا اضافہ کیا۔ کھدر کے پاجامے کی جگہ چھالٹین کے پاجامے استعمال کرنے لگے۔ اور اسی طرح طبیعت رو بصحت ہوتے ہوتے مکمل طور پر صحتیاب ہو گئے مگر داڑھی اپنی جگہ پر قائم تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ داڑھی شادی کرنے کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس لئے کہ حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب ایک مستند عالم ہی نہیں بلکہ عملی طور پر نہایت پکے مسلمان تھے۔ خود ان کے چہرے پر جو داڑھی تھی ویسی داڑھیاں سرسید کے بعد ذرا مشکل سے نظر آتی ہیں مگر لوگوں کا یہ خیال غلط تھا یہ داڑھی شادی کے سلسلہ کی کوئی چیز نہ تھی۔ اور نہ سسرالی اثر کے ماتحت تھی۔

شادی

آخر کار ہمارے بزرگوں نے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آپ نکاح کر دیجئے۔ لڑکی کو رخصت نہ کیجئے گا تاوقتیکہ آپ کی شرط پوری نہ ہو جائے یعنی لڑکا انٹرنس پاس نہ کر لے۔ اور اس کے علاوہ ان پر ایسا زور دیا گیا کہ وہ بجائے بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی سے عقد پر راضی ہو گئے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں حکیم صاحب قبلہ کا تمام خاندان لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ اور حکیم صاحب کے برادر عزیز مولوی محمد عثمان صاحب احمدی کے یہاں سب مقیم تھے طے یہ ہوا کہ یہیں عقد ہو جائے پھر رخصتی باقاعدگی کے ساتھ

ہوتی رہے گی۔ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۲۳ء کا چنانچہ دو دن تاریخ سب طے ہو جانے کے بعد نہایت سادگی کے ساتھ ہم خود ماموں صاحب اور والد صاحب کے ہمراہ رحمت منزل احاطہ حاکم فقیر محمد خاں پہنچے۔ اور خود ہمارے خسر صاحب نے ایک قریبی مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح ہمارے ساتھ پڑھ دیا۔ اس وقت دولہا کے چہرے پر داڑھی تھی اور غالباً اسی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ داڑھی کی ہی کرامت ہے کہ حکیم صاحب قبلہ نے انٹرنس پاس ہونے کی سخت شرط اور بڑی لڑکی کے عقد نہ ہونے کی تمام رکاوٹوں کے باوجود اس داڑھی کے زیر سایہ عقد پڑھ دیا۔

لیجئے صاحب شادی بھی ہو گئی۔ اور مین پوری کی اسی ساحرہ کے ساتھ شادی ہوئی جس کے لئے اس قدر بے قرار تھے۔ سعیدہ سجاد اب مسز سعیدہ شوکت تھانوی ہو گئیں۔ مگر اب تک ہم دونوں کے درمیان وہ شدید پردہ تھا کہ کیا کسی نامحرم سے وہ اس قدر چھپائی جاتی ہوں گی۔ مگر اب چونکہ ہماری آمد و رفت رحمت منزل میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اب ایک آدھ جھلک ہم بھی ان کی دیکھ لیتے تھے جو ہماری تھیں۔ اب تک تو صرف یہی تمنا تھی کہ وہ ہماری ہو جائیں۔ مگر اب یہ الجھن کہ ہماری ہو کر بھی ہم سے دور ہیں۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ اطمینان بھی تھا کہ ؎

عقد جب ہو ہی چکا ہے تو اب ان شاء اللہ
کچے دھاگے میں چلی آئیں گی سرکار بندھی

ایک حادثہ

اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی جوبلی منائی جا رہی تھی۔ اور والد صاحب قبلہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے وہاں آپ نے یکایک یہ رائے قائم کرلی کہ ہم کو علی گڑھ ہی میں داخل کر دیا جائے چنانچہ ہم کو علی گڑھ سے تار دیا کہ تم فوراً آجاؤ اور جوبلی اور جوبلی کے جشن کی سیر کرلو۔ تار ملتے ہی ہم علی گڑھ روانہ ہوگئے، علی گڑھ رات گئے پہنچے۔ اور سیدھے اسی ہوسٹل میں پہنچے جہاں والد صاحب مقیم تھے آپ وہاں اپنے کسی دوست کے صاحبزادے کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو علی گڑھ میں قانون کا مطالعہ کر رہے تھے چنانچہ جس وقت ہم پہنچے ہیں۔ والد صاحب نے فرمایا کہ تم اپنا بستر بندھا رہنے دو، میرے دوست کے لڑکے میاں حلیم کا یہ بستر بچھا ہے اسی پر سو رہو۔ وہ کسی کانفرنس میں گئے ہوئے ہیں۔ اور غالباً بہت دیر میں آئیں گے وہ آکر دوسری چارپائی کا انتظام کرلیں گے۔ اور تمہارا بستر بچھا کر سو رہیں گے چنانچہ ہم نے اس حکم کی تعمیل میں حلیم صاحب کے بستر کو اپنا لیا اور سو گئے مگر ابھی غالباً نیند آئی ہی تھی کہ خواب میں دیکھتے کیا ہیں۔ کہ ہم علی گڑھ آئے ہیں اور والد صاحب نے ہم سے وہی باتیں کہی ہیں جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہم سونے کی نیت کرنے سے پہلے غسل خانہ گئے ہیں تاکہ ضروریات سے فارغ ہولیں اور ضروریات میں سے صرف ایک ضرورت سے گویا ہم فارغ ہو رہے ہیں کہ یکایک آنکھ کھل گئی۔ حلیم صاحب کا تمام بستر تربتر خود ہم اپنی اسی ضرورت میں ڈوبے ہوئے۔ دم ہی نکل گیا۔ کہ یا اللہ اب کیا ہوگا پرایا بستر علی گڑھ کی فضا ہماری یہ عمر چہرے پر نورانی داڑھی، شادی شدہ

اور یہ بچوں کی سی حرکت مگر اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو ہی چکا تھا اور سوال یہ تھا کہ آخر کریں تو کیا کریں۔ سردی میں اس قدر جلد بستر خشک نہیں ہو سکتا تھا۔ بستر سے اٹھتے ہیں تو بری پر والد صاحب سو رہے ہیں ان کو خبر ہو جائے گی جس قدر غور کرتے ہیں اسی قدر رسوائی کے امکانات واضح ہوتے جاتے ہیں۔ بھاگ سکتے نہیں، آسمان دور اور زمین سخت والا معاملہ تھا نتیجہ یہ کہ ساری رات اسی فکر و تردد میں گزری کہ تقریباً ساڑھے چار بجے حلیم صاحب کانفرنس سے واپس آئے۔ ہم نے اسی عالم میں کہا، "اسلام علیکم، آپ عین وقت پر آ گئے۔

حلیم صاحب نے نہایت اخلاق سے کہا "کیوں کیوں خیریت"

عرض کیا، "سردی میں بستر چھوڑنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے اور پیاس ہے کہ گویا آج لگ کر پھر نہ بجھے گی۔"

حلیم صاحب نے فوراً ایک گلاس پانی ہم کو دے دیا مگر وہ ابھی دینے بھی نہ پائے تھے کہ ہم نے وہی گلاس بستر پہ الٹ لیا۔ اور "ارے" کا نعرہ بلند کر کے کھڑے ہو گئے۔ حلیم صاحب نے اس کو اپنی غلطی سمجھ کر ہم سے معافی مانگی اور ہم نے فراخدلی سے کام لے کر ان سے کہہ دیا کہ کوئی ہرج نہیں۔ میرا بستر موجود ہے اس کو بچھائے لیتے ہیں۔ اور دونوں اسی پر سو رہیں گے۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

یہ ترکیب پہلے سے ذہن میں نہیں آئی تھی بلکہ حلیم صاحب کی صورت دیکھتے ہی ایک دم یہ پلاٹ ذہن میں آ گیا اور جان بچ گئی۔ ورنہ علی گڑھ میں تو تالی پٹ جاتی بلکہ والد صاحب بھی وہیں تھے۔ تالی تو تالی ہم خود بھی پٹ جاتے۔

جوبلی کی سیر

جوبلی میں اپنے بہت سے دوست مل گئے۔ امین سلونوی۔ وصل بلگرامی۔ بہزادؔ فدا حسین، ساغر نظامی اور مولانا سیماب وغیرہ۔ ساغر صاحب تو سیماب صاحب کے پیمانہ بک اسٹال میں پھنسے ہوئے تھے۔ امین سلونوی اور وصل بلگرامی مرحوم ہمارے ساتھ رہے۔ وصل بلگرامی نے وہاں کے ڈائننگ کیمپ میں اپنا کچھ ایسا رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ منتظمین خود ان کو منتظم سمجھتے تھے حالانکہ کسی سے وصل صاحب پہلے سے واقف نہ تھے پہلی ہی مرتبہ کھانا کھانے گئے تھے کہ یکایک کسی بد انتظامی پر ایک دم بپھر گئے اور منتظمین کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ اگر یہی حال ہے تم لوگوں کا تو تم ہم سب کو بدنام کر دو گے لاؤ ادھر سے پلیٹیں۔ میں ادھر لگاتا ہوں۔ صرف دو رضاکار ادھر بھیج دو۔ باقی اس طرف کا انتظام تم دیکھو میں یہاں موجود ہوں اس دعویٰ اور اس استحقاق کے ساتھ ظاہر ہے کہ کوئی غیر متعلق آدمی احکامات دے ہی نہیں سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وصل صاحب کے اشاروں پر، امین صاحب کی ہدایتوں پر اور ہمارے احکامات پر ڈائننگ کیمپ کے تمام لوگ ناچے ناچے پھرتے تھے جس کو جہاں چاہا تعینات کر دیا جس سے جو کام چاہا لے لیا۔ اور پھر لطف یہ کہ سات روز تک صبح اور شام دونوں وقت اچھے سے اچھا کھایا۔ اور چونکہ ہم خود منتظم تھے۔ لہٰذا قیمت کا تو کوئی سوال ہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ تو ہم نے ایک دوست کی اسی ڈائننگ کیمپ میں دعوت بھی کر دی اور کچھ خرچ بھی نہ ہوا۔ کھانے کی طرف سے یہ انتظام حسب دلخواہ ہو ہی گیا

تھا لہذا بے فکری کے ساتھ جشن کی مختلف تقریبات میں حصہ لیتے رہے۔ اور جوبلی کا وہ تاریخی مشاعرہ بھی دیکھا جس کے بعد سے شاعر علی گڈھ کا نام سن کر اختلاج قلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں عجیب طوفان خیز مشاعرہ تھا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مشاعرہ کی صدارت کر رہے تھے۔ خواجہ مسعود علی صاحب ذوقی مشاعرے کے سکریٹری تھے۔ ہر طرح کوشش کی جا رہی تھی۔ کہ کسی طرح طلبا، اپنی ذہانت کا تختۂ مشق شعرائے کرام کو بنائیں۔ مگر توبہ کیجیے کہیں علی گڈھ کے لڑکے ماننے والے تھے ایک صاحب نے خواندگی سے قبل فرمایا کہ حضرات میں صرف تین شعر پڑھنا چاہتا ہوں۔ سکون سے سن لیجیے، مشترکہ آواز آئی "ارشاد"۔ شاعر نے مطلع پڑھا تو داد کے بجائے پورا پنڈال چیخ اٹھا "ایک"۔ دوسرا شعر پڑھا تو سب نے ہم آواز ہو کر کہا "دو" تیسرا شعر پڑھا تو سب نے نعرہ بلند کیا "تین" چوتھا شعر پڑھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ لائٹ گل۔ اور ایک ہلڑ۔ ایک اور مشہور استاد گلوبند باندھے ڈائس پر تشریف لائے۔ سکریٹری نے تعارف کرایا تو ایک آواز بلند ہوئی "حضرت کا منہ کدھر ہے" اور واقعی گلوبند اس شان سے بندھا ہوا تھا۔ کہ بغیر بتائے منہ کا پتہ چلنا دشوار تھا۔ ایک بزرگ نے غالباً یہ ترکیب مناسب سمجھی کہ اگر میں نعتیہ کلام پڑھوں گا تو کسی کو تمسخر کا موقع نہ ملے گا۔ لہذا آپ نے پہلا ہی نعتیہ مطلع پڑھا کہ کسی نے پکار کر کہا "اس کا اجر آپ کو خدا دے گا۔ تشریف رکھئے" مختصر یہ کہ کوئی شاعر ایسا نہ گیا جو کوئی ریمارک لے کر واپس نہ آیا ہو۔ بہت سے شاعروں نے اپنا کلام سنانے سے انکار کر دیا۔ اور جو ایسے ہی بے چین تھے۔ وہ ڈائس پر گئے۔ اور کچھ نہ کچھ سن کر واپس آئے۔ اس مشاعرے کے بعد سے علی گڈھ کی یونیورسٹی کے مشاعرے بہت نام ہو گئے تھے۔ مگر رفتہ

رفتہ یہ اثر ختم ہو گیا۔ اور پھر کسی مشاعرے میں شعرائے کرام کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوا۔

علیگڈھ سے واپسی

علی گڑھ سے واپسی کے بعد علی گڑھ کا کورس خریدا گیا۔ اور خاص طور پر امتحان کی تیاریاں ہونے لگیں۔ طے یہ ہوا تھا۔ کہ ایک سال تک گھر ہی پر پوری تیاری کرکے ایکدم علی گڑھ سے پرائیوٹ طور پر امتحان دے دیں گے۔ اس مرتبہ ہم سنجیدہ تھے۔ اس لئے کہ اب ذمہ داری کا احساس بھی بڑھ رہا تھا۔ اور سعیدہ اور اپنے درمیان سے اس انٹرنس والی شرط کو بھی ہٹانا تھا۔ لہذا زندگی میں پہلی مرتبہ سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ ادھر ادھر جاکر پڑھا چونکہ تمام مضامین سوائے اردو فارسی اور انگریزی کے بیحد کمزور تھے خصوصاً ریاضی۔ لہذا بہت سخت محنت کرنا پڑی رات رات بھر جاگتے تھے۔ دن دن بھر محنت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب پوری طرح خود اپنے اطمینان کے قابل تیار ہو گئے۔ تو یکایک بیمار پڑ گئے بخار آیا اور جم کر رہ گیا۔ اور نہایت خطرناک طریقہ پر ٹمپریچر بڑھنے اور گھٹنے لگا۔ یعنی دن بھر کم اور شام کو زیادہ، ایک مہینہ اسی طرح ہو گیا۔ دوسرا مہینہ گزرا۔ اور آخر کار ڈاکٹروں نے یہ خبر سنادی کہ دق ہو چکی ہے۔ لڑکے کو بھوالی سینی ٹوریم بھیجا جائے۔ والدین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مگر خان بہادر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب اس رائے سے متفق نہ تھے۔ اور وہ اب تک بھی مختلف معائنے کر رہے تھے۔ کبھی تھوک دیکھتے کبھی خون اور کبھی ایکسرے کراتے۔ آخر ایک دن انھوں نے فرمایا کہ رات کے بارہ بجے ان کا خون نکالا جائے پھر اس کو دیکھوں گا۔ چنانچہ رات

گے بارہ بجے یہ "شب خون" ہوا۔ اور دوسرے دن ڈاکٹر صاحب کے معائنہ کے لئے بھیجا گیا۔ سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب بغیر بلائے خود ہی آ گئے ان کے چہرے پر اس وقت مارے خوشی کے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ آتے ہی آپ نے نعرہ بلند کیا "میری رائے صحیح نکلی" دق ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس مرض کا نام ہے فائلریا (FILARIA) اور اس کے جراثیم رات کے بارہ بجے خون میں گردش کرتے ہیں۔ دن بھر تلی میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا مرض ہوتا ہے معلوم ہوا کہ اس سے گھینگھا نکل سکتا ہے۔ فیل پا ہو سکتا ہے۔ وغیرہ۔ مگر اس کا علاج ہو جائے تو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ حضرت بھی گورکھپور کی طرف گئے ہیں اور وہاں سے یہ مرض لگا لائے ہیں۔ ہم واقعی گورکھپور کی طرف کیا معنی خود گورکھپور گئے تھے۔ اور وصل صاحب بلگرامی کے یہاں سے یہ مرض لے کر آئے تھے۔ چنانچہ اب مرض کی تشخیص ہو جانے کے بعد علاج بالکل آسان ہو گیا۔ کلکتہ سے انجکشن منگائے گئے اور تقریباً پچیس تیس انجکشن ہوئے ہوں گے کہ ہم صحت یاب ہو گئے۔ البتہ اس سلسلے میں یہ سال خراب ہو گیا۔ اور تیاری کر چکنے کے باوجود امتحان نہ دے سکے۔ اس علالت کا فائدہ یہ ضرور پہونچا کہ داڑھی منڈ گئی۔

والد صاحب کی علالت

ہم اچھے ہوئے ہی تھے کہ والد صاحب کے سرطان کا پھوڑا نکل آیا۔ عرصہ سے پیشاب میں شکر آتی تھی۔ مگر پرہیز کبھی نہ کیا۔ ڈاکٹر کہا کرتے تھے کہ آپ زمین کے

نیچے کی ترکاریاں کھائیں تو جواب ہمیشہ یہی دیتے تھے۔ کہ کیا تارڈ کا شوربہ کھایا کروں یا آسمان کے ستاروں کی بھجیا۔ شکر اور مٹھائی تک کھانا چھوڑی۔ شکر پر پابندی عائد ہوئی۔ تو فرمایا کہ بہتر ہے۔ میں گڑ کھایا کروں گا۔ مختصر یہ کہ کبھی کسی پرہیز کے لئے تیار نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کاربنکل نکلا اور اس کا نہایت خوفناک آپریشن ڈاکٹر حافظ حفیظ اللہ صاحب نے کیا۔ تقریباً آدھ سیر گوشت کاٹ کر پھینک دیا۔ زخم کا قطر ایک بڑے گھڑے کے دہانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مگر اتنا بڑا آپریشن کرانے کے بعد بھی ان کے چہرے پر کمزوری کی کوئی علامت پائی نہ جاتی تھی۔ لنکس ہاسپٹل کے پرائیویٹ وارڈ میں رکھے گئے۔ اور ان کی تیمارداری میں ماموں صاحب اور ہم شب و روز مصروف رہے۔ اسی علالت کے زمانہ میں ایک روز جبکہ ہم ان کا بیڈ پان صاف کر رہے تھے اور پاخانہ کا برتن صاف کر کے رکھ چکے تھے۔ ہمارے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ اسی دن کے لئے لوگ اولاد کی تمنا کرتے ہیں۔ کم سے کم میرے لڑکے نے حق ادا کر دیا۔ ماموں صاحب نے جو کبھی کسی بچے کی تعریف کرنا گناہِ عظیم سمجھا کرتے تھے۔ آج پہلی مرتبہ فرمایا کہ اس لڑکے نے ایسی خدمت کی ہے کہ میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ اور یہ انشاءاللہ بڑی ترقی کرے گا۔ اس وقت والد صاحب ہماری طرف کچھ ایسی پیار کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ہم ضبط نہ کر سکے اور رو دیئے۔ والد صاحب نے پیار سے کہا: بیوقوف ہوا ہے۔ ارے اب میں اچھا ہوں۔ مگر در اصل وہ اچھے تھے نہیں۔ اتنا بڑا زخم اگر معمولی حالات کے ماتحت برابر مندمل ہوتا رہتا تو بھی کم سے کم ایک مہینہ سے پہلے وہ بستر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور اسی قدر وقت کمزوری اور بیماری کے اثرات دور ہونے کے لئے درکار

مگر یہاں تو حال یہ تھا کہ آج زخم میں یہ خرابی ہو گئی۔ کل یہ نقص پیدا ہو گیا۔ ایک مرتبہ زخم میں زہریلے چھالے پڑ گئے اور ڈاکٹر صاحب بھی سخت بدحواس ہو گئے کہ اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ مگر خدا نے فضل کیا۔ اور دوسرے ہی دن حالت سنبھل گئی۔ ہم مسلسل والد صاحب کے ساتھ رہے۔ اور ان کو کبھی کسی ملازم کی کسی خدمت گاری، یہاں تک کہ مہتر تک کی ضرورت محسوس نہ ہونے دی۔ حالانکہ ملازم برابر موجود رہتا مگر مجھے اس پر اعتبار نہ تھا۔ اس لئے کہ اس کے دل کو نہ لگی تھی۔ وہ تو محض تنخواہ پانے کے لئے یہ خدمت کرتا تھا۔ ہم کو خود والد صاحب کا ہر کام کر کے ایک اطمینان سا محسوس ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے دو مہینہ کے بعد زخم قریب قریب مندمل ہو گیا۔ اور ڈاکٹر سے لڑ جھگڑ کر آپ اس وعدے پر گھر آ گئے کہ باقاعدہ احتیاط کے ساتھ گھر ہی پر ڈریسنگ کرائیں گے۔ مگر گھر پر آ کر علاج میں اپنی رائے سے ردوبدل کرنے لگے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زخم مکمل طور پر بہت دنوں میں ٹھیک ہوا۔

پہلا مزاحیہ مضمون

تعلیم تو اب گویا ختم ہو ہی چکی تھی۔ کبھی کبھی ارادہ ہوتا تھا کہ پرائیویٹ طور پر کسی امتحان میں بیٹھ جائیں مگر رفتہ رفتہ یہ ارادے بھی ختم ہو گئے اور اب ہم بالکل ہوہم ممبر تھے۔ خالص انشا پرداز اس زمانہ میں "رسالہ ترچھی نظر" جو ایمن سلونی صاحب کی ادارت میں رسالہ "نظر" بن چکا تھا اور اس کا ترچھا پن ترکا جا چکا تھا۔ ہمارے افسانوں سے کسی ماہ خالی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم

نہیں کیا سوجھی کہ ایک مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" کے نام سے لکھ دیا۔ یہاں عرض کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا۔ اس مضمون سے پہلے ہم نے کوئی مضمون دیکھا یا سنا کبھی نہیں تھا۔ تفریحی لٹریچر اردو کا ہی مضامین ہماری نظر سے اب تک نہیں گزرے تھے۔ اور ہم نے اپنے نزدیک یہ گویا بڑا تیر مارا تھا۔ یہ مضمون عام طور پر بہت پسند کیا گیا حالانکہ تھا بڑا عوام پسند قسم کا سطحی مضمون جس کو دیکھ کر اب بہت شرم آتی ہے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم اسی طرز کے لئے اپنے قلم کو مخصوص کر دو۔ مگر ہم نے اس مزاحیہ مضمون کے بعد پھر بہت دنوں تک کوئی مزاحیہ چیز نہیں لکھی البتہ سنجیدہ مضامین اور افسانے لکھتے رہے۔

رسالہ حسنِ ادب

اب تک ہم صرف رسالہ ترچھی نظر اور اس کے اسی کی اصلاحی تشکیل رسالہ نظر سے واقف تھے۔ مگر ایک دن پاٹا نالہ کے بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا "رسالہ حسنِ ادب لکھنو" اور سامنے ہی ایک صاحب بیٹھے تھے۔ کرتا اتارے، پاجامہ پہنے۔ سر منڈا ہوا۔ اور کانوں میں اکھاڑے کی لگی ہوئی مٹی۔ صورت دیکھ کر پتہ چل گیا کہ آدمی ہیں پہلوان قسم کے اور اس وقت غالباً اس رسالہ کے ایڈیٹر صاحب کو دور کرانے یا کسی مضمون پر خفا ہو کر ان کو چیت کرنے تشریف لائے ہیں۔ ان سے دریافت کیا کہ کیا یہاں سے کوئی رسالہ نکلتا ہے۔ آپ نے فوراً چٹائی پر دو ہاتھ مار کر گرد اڑائی۔ اور ارشاد فرمایا تشریف رکھئے۔ ہم نے بیٹھ کر پھر وہی سوال کیا جواب

ملا۔ جی ہاں نکلتا ہے۔ مگر اس مرتبہ اس کے دو نمبر ساتھ ساتھ نکل رہے ہیں۔ تازہ پرچہ پچھلے مہینہ سے اب تک نہیں نکلا ہے۔ اس لیے پچھلے پرچے کو اور اس پرچہ کو ایک ساتھ ملا کر نکالا جا رہا ہے۔" ہم نے دریافت کیا کہ کون صاحب نکالتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کون ہیں۔ باقاعدہ دفتر کہاں ہے۔ ان تمام سوالوں کے جواب میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت خود ہی سب کچھ ہیں۔ ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

آپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے۔ خود ہی مدیر تھے۔ خود ہی کاتب تھے۔ خود ہی مصلح سنگ تھے خود ہی پریس مین تھے۔ بلکہ صورتا سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ خود ہی پریس بھی ہوں گے۔ مگر سامنے ہی ایک دستی پریس ان حضرت کا کرتا پہنے کھڑا تھا اس وقت یہ حضرت اسی رسالہ کی کاپی بیٹھے لکھ رہے تھے آپ نے بتایا کہ میں سب کام خود ہی کرتا ہوں اور یہ رسالہ اپنے تمام مدارج میرے ہی ہاتھوں طے کرتا ہے۔ آپ نے رسالہ کا ایک گزشتہ پرچہ دکھایا جس پر ادارت میں سید محمود الحسن تقوی کا نام لکھا ہوا تھا۔ ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اب اس کی ادارت نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کچھ زیادہ اچھے آدمی ثابت نہیں ہوئے۔ اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ آپ ایک معقول قسم کے آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جا سکے۔ اور جو رسالہ سے کچھ دلچسپی بھی لے سکے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں ایڈیٹر کو کسی قسم کا معاوضہ تو خیر نہیں دیتا۔ مگر ایڈیٹری یہ تو آپ جانتے ہوں گے۔ کہ کتنی عزت کی چیز ہے ارے بھئی اس کو یوں سمجھئے کہ یہ گویا بڑی عزت کی چیز ہے کیا نام کہ ایڈیٹر ہونا ہر ایک کو میسر ہی کب آتا

ہے۔ ہم نے کہا۔ آپ نے کہا بجا ارشاد فرماتے ہیں۔ بہرصورت آپ کا یہ تازہ پرچہ تو چھپ ہی رہا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی اور نمبر اس کا نکل سکا۔ تو میں بھی اس کے لئے مضمون دوں گا۔ آپ نے فرمایا "مضمون اگر آپ دے دیں تو کیا نام کہ اسی رسالہ میں یعنی اسی نمبر میں نکل سکتا ہے ابھی کافی جگہ ہے صرف ایک ہی مضمون میرے پاس ہے اور ایک غزل ہے اور نکالنا ہے دوہرا پرچہ کیا نام کہ دو مہینوں کا گویا مشترکہ پرچہ" ہم نے ان سے اسی طرح دیر تک گفتگو کرنے کے بعد یہ وعدہ کر لیا کہ ایک سے زیادہ مضمون ان کو دے دیں گے اور اس وعدے کو دوسرے ہی دن وفا بھی کر دیا۔ یعنی ایک افسانہ اور ایک مضمون جو غالباً برسات یا کالی رات یا صبح بنارس یا شام اودھ کے متعلق کچھ بکواس تھی دے دیا ان مضامین کو دیکھ کر ان حضرت نے کچھ غور کرنا شروع کر دیا۔ ہم سمجھے کہ ان مضامین کو اپنے معیار پر جانچ رہے ہیں۔ مگر قصہ کچھ اور ہی تھا چنانچہ ایک دم چونک کر فرمایا۔ "اور اگر میں آپ کا نام ایڈیٹری میں دے دوں۔" ہم کو اس کی امید کبھی نہ تھی کہ ہمارے حصہ میں یہ اعزاز آنے والا ہے۔ ہم نے کچھ دیر تامل کیا غور کرتے رہے کہ یہ اعزاز قبول کرنا چاہیے یا نہیں۔ آخر ہم نے ایک فیصلہ کن انداز کے ساتھ کہا۔ بات یہ ہے واحد علی صاحب (یہ ان بزرگ کا نام نامی تھا) کہ مجھے اس میں کوئی عذر تو نہیں ہے مگر میں رسالہ کی موجودہ شکل بدلنے کا مطالبہ کر دوں گا۔ اس میں فی الحال بہت ہی لچر قسم کے مضامین نکل رہے ہیں" واحد علی صاحب نے جلیبی کھاتے ہوئے فرمایا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے کیا نام کہ آپ اس کو بہتر ہی بنائیں گے۔ اس میں میرا کیا نقصان ہے ارے بھئی یہ تو کیا نام

کہ اپنے ہاتھ کی بات ہے ذرا ہاتھ سنبھال کر رکھ دیا کیجئے۔ کتابت میں مزہ ہی کچھ اور پیدا ہو جائے گی۔ ذرا احتیاط سے پتھر بنا دیا۔ آئینہ ہو گیا۔ مختصر یہ کہ ہم نے ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہو گیا۔ اب جو تازہ نمبر نکلتا ہے تو سرورق پر لکھا تھا۔ ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی' یہ ملک التحریر اس لئے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے "رئیس التحریر" ہماری نظر سے گزر چکا تھا۔ لہذا ہم نے اپنے لئے ملک التحریر سے کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا۔ منشی واحد علی صاحب اب بھی موجود ہیں اور اخبار سرپنچ کی کتابت فرماتے ہیں ان کا پرچہ اور پریس سب غالباً جلیبی والے کے نذر ہو گیا۔

رخصتی

۱۹۳۴ء کے اوائل ہی سے ہماری طرف سے یہ کوشش شروع ہو چکی تھی کہ کسی طرح رخصتی کی رسم پوری کر دی جائے۔ اور ہماری سعیدہ ہمارے پاس آ جائیں مگر ہمارے خسر صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ یہ تقریب عمل میں آئے۔ والدہ صاحبہ سے خط لکھوائے۔ والد صاحب نے اصرار کیا اور جب سب کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تو مارے عقلمندی کے ہم نے نہ معلوم ان کو خط میں لکھ دیا جس کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا تھا۔ کہ اگر آپ کو رخصتی سے انکار ہے تو اب مجھ کو بھی اس رشتہ سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ٹھہرے عالم دین اس خط پر ان کو یہ شبہ ہو گیا کہ کہیں صاحبزادہ بلند اقبال نے اپنا پہلا ہی رنگ نہ دکھایا

اب ان سے دریافت کرکے لکھا جائے کہ ان کا دراصل مدعا کیا ہے تاکہ ان کے الفاظ واضح صورت میں میرے سامنے آئیں۔ تو میں فیصلہ کروں کہ کہیں اس سے خدانخواستہ طلاق کا مفہوم تو پورا نہیں ہوتا ہے۔ والد صاحب نے یہ خط دیکھا اور ہم کو گھر سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا۔ پیچھے چلے تھے گھر بسانے وہاں گھر اجڑنے کے سامان ہو گئے۔ آخر ہم نے پھر نہایت مہذب قسم کا معذرت نامہ لکھا۔ اپنے پچھلے خط کے الفاظ اس عمدگی سے واپس لئے کہ خسر صاحب یہ خط پاکر باغ باغ ہو گئے۔ اور گھر میں جاکر عورتوں سے کہا کہ صاحب یہ شخص قلم کا بادشاہ ہے۔ ایک ہی خط میں میرے اس رنج اور غصہ کو کافور کر دیا جس کے متعلق میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میرا دل کیونکر صاف ہوگا۔ گویا پہلے خط سے ہم قلم کے غلام ثابت ہوئے تھے۔ اور دوسرے خط نے اسی خاندان غلاماں کو سریر آرائے سلطنت کر دیا۔ مگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ رخصتی کی تاریخ طے ہو گئی اور دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء ہم پھر ایک مرتبہ دولہا بن کر لکھنؤ سے مین پوری گئے۔ والد صاحب قبلہ پہلے ہی سے مین پوری کی نمائش میں خان بہادر سید زین الدین کلکٹر مین پوری کی دعوت پر تشریف لے جا چکے تھے۔ آپ نے تار پر اطلاع دی کہ تم لوگ آجاؤ میں یہیں بارات میں شامل ہو جاؤں گا۔ لہٰذا ماموں صاحب ہم کو اور ہمارے ایک دوست کو لے کر مین پوری روانہ ہو گئے۔ یہ گویا تین آدمیوں کی برات تھی۔ اور جتنے تھے باراتی مین پوری ہی میں موجود تھے۔ نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی عمل میں آئی۔ کسی قسم کی کوئی رسم ادا نہیں کی گئی۔ محض یہ کہ سلام کرائی ہوئی اور جو تھوڑا بہت روپیہ اس سلسلہ میں ملا۔ وہ ماموں صاحب کے حوالے کرکے ہم اپنی

سعیدہ کو لکھنؤ لے آئے یہاں البتہ مہمان بھی کافی تھے۔ اور گھر میں شادی کی چہل پہل بھی نظر آ رہی تھی۔

دو رسمیں

ہر چند کہ شادی کے سلسلہ کی تمام رسموں کے لئے والد صاحب نے بھی منع کر دیا تھا۔ اور ہم بھی ان رسموں سے بالکل متفق نہ تھے بلکہ رسموں کے بائیکاٹ کا اعلان کر چکے تھے۔ مگر پھر بھی دو رسمیں ہو کر ہی رہیں پہلی رسم یہ کہ دلہن کے دامن پر کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ گویا نماز پڑھوائی جائے تو وہ بھی دلہن کو جار نماز بنا کر عبادت کی جائے۔ مگر شرک کی آغوش میں۔ مگر اب ان بڑھیوں سے کس کا بس چل سکتا تھا۔ کھڑے ہو کر نیت باندھی کہ: نیت کرتا ہوں میں دو رکعت نماز کی جس کی ذمہ داری اس گھر کی بڑی بوڑھیوں کے سر ہے۔ وقت جو نماز کے ہر وقت سے الگ ہے۔ منہ میرا طرف بیوی کے اللہ معاف کرے، اور اس کے بعد نہ جانے کیا زیر لب بڑبڑاتے رہے اور اسی طرح یہ نماز ختم ہو گئی دوسری رسم کھیر چٹائی کی تھی۔ کہ دلہن کو کھیر چٹاؤ اور اس کے ہاتھ سے کھیر چاٹو۔ اس رسم سے بھی کسی نہ کسی طرح جان چھوٹی۔ وہ تو کہئے کہ ان دونوں رسموں کے بعد دولہا میاں بھاگے سر پہ پیر رکھ کر۔ ورنہ یہ عورتیں تو اس وقت تک دم ہی نہیں لیتیں جب تک کہ دولہا کی سات پشتوں کو احمق بنا کر نہ رکھ دیں ان کے نزدیک تو سب سے زیادہ کامیاب دولہا وہی ہوتا ہے جو سب سے زیادہ چغد ثابت ہو۔ معلوم یہ ہوا کہ وہاں آرسی مصحف کے انتظامات بھی تھے۔ مگر

خدا نے ہم کو بال بال بچا دیا۔

دلہن کی نماز

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہماری خالہ اماں بیگم صاحبہ بہادر شیخ احمد علی صاحب نے ہم کو بلا کر مبارکباد دی کہ بھیا میں تو مبارکباد اس بات کی دیتی ہوں کہ دلہن اللہ رکھے ہے بچی نمازن۔ اس نے اپنے دلہناپے کی پرواہ کبھی نہیں کی اور چادر تنوا کر اسی دلہناپے تمام وقتوں کی نماز پابندی سے پڑھ چکی ہے۔ ہم ان کے سامنے تو مسکرا کر رہ گئے۔ مگر دل میں ایک تشویش یہ پیدا ہو گئی کہ

نبھے گا کس طرح سے اس پری پیکر سے یارانہ
کہ وہ اتنی نمازن اور یہ گھر پورا بت خانہ

چنانچہ یہ تشویش بعد میں صحیح بھی ثابت ہوئی اس لئے کہ شادی کے بعد سے اب تک اس سلسلہ میں ایک کشمکش جاری ہے۔ نہ وہ ہم کو نماز پڑھوا سکیں نہ ہم ان کی نماز چھڑا سکے۔ وہ تو خیر بلا وجہ نماز نہیں چھوڑ رہی ہیں مگر ہمارے پاس نماز نہ پڑھنے کا ایک بہت بڑا عذر موجود ہے کہ اب اگر ہم نے نماز پڑھی تو خدا ہم سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ اے بندے تو نے ہمارے کہنے سے تو نماز پڑھی نہیں۔ اب بیوی کے کہنے سے کیوں پڑھ رہا ہے اور اس حالت میں یہ نماز ہمارے لئے ہوئی یا تو اپنی بیوی کے لئے پڑھتا ہے؟ ان حالات کے ماتحت انتظار ہے۔ اس وقت کا جب خدا بیوی کو یہ توفیق دے کہ وہ نماز

کے لیے کہنا چھوڑ دیں۔ اور ہم کو یہ توفیق عطا کرے کہ ہم جس کی نماز ہو اسی کیلئے پڑھیں

سعیدہ سے ملاقات

دن بھر کے انتظار کے بعد رات آئی اور وہ بھی آدھی گزر گئی تو اندر سے طلبی ہوئی اور ہم دھڑکتے ہوئے دل اور سنسناتے ہوئے ہاتھ پیر کے ساتھ ڈگمگاتے ہوئے اندر پہنچے۔ سب سے پہلے والدہ صاحبہ نے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ کیا خوبصورت دعا دی ہے۔ کہ "جاؤ میاں خدا کرے اس کی ایڑی دیکھ کر کسی اور کی صورت نہ دیکھو" شاعر کا اس شعر سے خواہ کچھ بھی مطلب ہو مگر ہم کور چشمی کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ماں کی بد دعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے چنانچہ ان کی ایڑی دیکھ کر آج بھی اچھی صورت پر بھی نظر پڑ ہی جاتی ہے والدہ صاحبہ نے ایک اور عزیزہ کو اشارہ کیا اور وہ ہم کو حجلۂ عروسی میں لے جاکر چھوڑ آئیں۔ جہاں ہماری سعیدہ ایک لال رنگ کی گٹھری بنی بیٹھی تھیں اور ہماری نگاہوں میں ان کا وہی تمکنت مآب چہرہ گھوم رہا تھا جب وہ مین پوری میں ہم سے کہہ رہی تھیں۔ کہ اپنی شادی میں ہم لوگوں کو بھلا کیوں بلانے لگے۔ ان بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ یہ شخص اپنی شادی میں صرف ان ہی کو بلائے گا۔ تنہائی ہوتے ہی ہم نے سعیدہ سے کہا کہ سنئے جناب اب اپنی گردن سیدھی کیجئے اور پچھلی چھوڑ کر آدمیت کے جامے میں آجائیے۔ مگر وہ بھلا کب سننے والی تھیں آخر ہم نے خود ان کی گردن سیدھی کر دی۔ اور ایک لکچر دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ یہ شرم و حیا ایک حد کے بعد جہالت کی نشانی بن جاتی ہے، آپ ماشاء اللہ

پڑھی لکھی سمجھدار ہیں۔ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں کی باہمی زندگی کا یہ پہلا دن یا پہلی رات ہے اگر اس زندگی کی ابتدا ان چونچلوں اور اس جہالت سے ہوئی تو اللہ حافظ ہے۔ لہذا میرا مشورہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلے آپ سے مصافحہ کر دوں۔ شرعی طور پر دو سال قبل آپ اپنے کو میرے حوالے کر چکی ہیں اور آج اپنا ہاتھ بڑھا کر اس قول کی تصدیق کر دیجئے ہمارا لیکچر ختم ہو گیا۔ مگر وہاں سے کوئی رسید نہ آئی۔ اور ہم دیر تک ہاتھ بڑھائے کھڑے رہے۔ آخر ہم نے اور زیادہ متاثر کرنے والے الفاظ ڈھونڈ کر تقریر کی۔ کہ دیکھئے یہی وقت ہے جو ہم دونوں کی زندگی بنانے یا بگاڑنے کا فیصلہ کرے گا۔ اس امتحان کے وقت آپ کا اس طرح خاموش رہنا کوئی خوشگوار نتائج مشکل سے پیدا کرے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ اپنا مستقبل کچھ خوشگوار بنیادوں پر ہم دونوں تعمیر کریں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ خدانخواستہ بہری نہیں ہیں۔ میرے الفاظ سن رہی ہوں گی۔ گونگی بھی نہیں میری بات کا جواب دے سکتی ہیں۔ لہذا اب آپ منہ سے بولئے سر سے کھیلئے اور سب سے پہلے اپنا یہ مہمل گھونگھٹ الٹ دیجئے۔ جس سے مجھے اختلاج ہو رہا ہے پھر جواب ندارد اور حالات حسب معمول مجبوراً ہم نے خود گھونگھٹ الٹ دیا۔ اور ان سے استدعا کی۔ کہ خدا کے واسطے اپنی ناک سے یہ نتھ اتار دیجئے جسے دیکھ کر یا تو میں بھاگ جاؤں گا۔ ورنہ یہیں گر پڑوں گا۔ اور اگر اس سلسلہ میں بھی آپ نے میری شنوائی نہ کی۔ تو میں آپ کو مزید زحمت دیئے بغیر یہاں سے دفعان ہو جاؤں گا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری درخواست فوراً منظور ہو گئی اور نتھ جلدی سے اتار دی گئی۔ اب گویا حالات امید افزا تھے۔ لہذا ہم نے موقع غنیمت

جان کر کہا، شاباش، دل خوش ہو گیا۔ اب البتہ انسانوں کی سی صورت معلوم ہوتی ہے پہلے تو تھہ پہن کر آپ دنیا کا نقشہ نظر آ رہی تھیں۔ اچھا اب مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیے۔ بڑھائیے جلدی ہاتھ ایک دو تین۔ چار میں دس تک گنتا ہوں اس عرصہ میں آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ ایک، دو، تین، چار پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو اور، اور، اور اچھا تو خدا حافظ ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ وہاں ایک جنبش ہوئی۔ اور ہم نے پھر کہا، "جی ہاں۔ آٹھ۔ نو۔ اور" ایک خفیف سی جنبش کے بعد ہاتھ میں ہاتھ لے کر کہا، "واقعی سعیدہ تم میری توقع کے بالکل خلاف ثابت ہو رہی ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ تم عام دلہنوں سے مختلف ایک سمجھدار دلہن ثابت ہو گی۔ اور ان دقیانوسی ڈھکوسلوں کی ہرگز قائل نہ ہو گی آخر یہ کیا واہیات ہے اچھا بتاؤ تم میری کون ہو۔ بولو۔ ادھر دیکھو۔ منہ اٹھاؤ اور دیکھ کر بتاؤ۔ تم میری کون ہو"۔ منہ تو خیر نہیں اٹھایا۔ مگر ایک نہایت باریک مگر کھنکتی ہوئی آواز میں جواب ملا، "کنیز"۔ ہم ایک دم اچھل پڑے کہ ارے واہ ری میری بیوی کوئی اور عورت ہوتی تو لونڈی کہتی۔ اس موقع پر لفظ "کنیز" یہ علامت ہے پڑھی لکھی ہونے کی۔ لونڈی کا لفظ سن کر جو تخیل دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک میلی کچیلی بکالی کلوٹی موٹی سی ناک اور نیلے ہونٹوں والی لونڈیا سامنے کھڑی اپنے جوتے ٹونچنے کے انداز سے کھجا رہی ہے اس کی چندھی چندھی آنکھوں میں کیچڑ بھی بھری ہے۔ مگر کنیز سن کر ایک دوسری تصویر سامنے آتی ہے کہ گویا مصر کے کسی بازار میں کھڑے ہیں۔ اور وہاں ایک دھان پان نازک سے نقشہ والی گوری چٹی سادہ لباس پہنے معصوم سی کنیز ہمارے سامنے ......

موجود ہے۔ جو ہمارے احکامات کی منتظر ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ ہم کو خود کوئی حکم دے۔ اور ہم اس کی تعمیل کریں۔ بہر صورت اس وقت سعیدہ کی زبان سے کنیز سن کر ہم نے ان کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اور اب تک جتنی انسانیت اور شرافت برتی تھی۔ ان سب کی تلافی کر دی نتیجہ یہ کہ ابھی اندھیرا ہی تھا اور کچھ خفیف سی بارش بھی ہو رہی تھی کہ سعیدہ نے ہم کو کمرہ سے باہر نکل جانے کا حکم دیا اور باہر نکل کر ہم نے دیکھا تو واقعی ابھی کافی دیر تھی۔ دن نکلنے میں۔ چوروں کی طرح زنانہ حصے سے نکل کر مردانہ نشست میں آئے اور اپنے ایک عزیز کے بستر میں گھسے ہی تھے کہ وہ حضرت نہ جانے کیا سمجھ کر چیخ اٹھے اور سونے والوں میں سے کم سے کم آدھے لوگوں کو تو ان حضرت نے جگا کر یہ خبر کر ہی دی کہ ہم باہر آگئے ہیں۔ اسی دن دعوت ولیمہ تھی۔ مگر شکر ہے۔ چوتھی۔ چالے۔ وغیرہ سے ہم کو واسطہ نہ پڑا۔

شوہرانہ ٹھاٹھ

اب ہم خود اپنی نظر میں کچھ وقیع کچھ بھاری بھرکم اور کچھ ذمہ دار سے معلوم ہونے لگے تھے۔ حالانکہ غیر ذمہ داریوں کا عالم یہ تھا کہ بیوی گھر میں آچکی تھی، اور ہم مطلق العنان تھے۔ نہ کمانے کی فکر نہ کچھ تدبیر مستقبل تعلیم چھوٹ ہی چکی تھی۔ گھر کی خبر بھی ہم کو تھی کہ معلوم نہیں خرچ کیونکر چلتا ہے، اور اچھی خاصی شاندار زندگی بسر ہوتی ہے۔ جو دیکھتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ کھاتا پیتا گھرانہ ہے۔ مگر گھر میں بس اللہ کا نام ہی تھا والد صاحب کی معمولی پنشن کے علاوہ اور کوئی خاص آمدنی نہ تھی جو روپیہ جمع تھا۔ وہ خرچ ہو چکا

تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی ہمارے ذہن میں نہ آسکی۔ ہم تو اپنے شوہرانہ ٹھاٹھ میں تھے۔ کہ ایک علیحدہ سجا ہوا کمرہ ہم کو مل گیا تھا جس میں معطر معطر ایک دلہن شام کو پھولوں سے لدی اور دن کو بھیگے بال پشت پر کھولے ہوئے ہم کو ملا کرتی تھی۔ ہم سو جاتے تھے تو وہ بیچاری پنکھا جھلا کرتی تھی۔ ہم کو خوش کرنے کے لئے وہ ہماری مہمل سے مہمل بات پر بھی ہنستی تھی۔ گویا ہم واقعی بہت بذلہ سنج اور بڑی خوشگوار گفتگو کرنے والے تھے۔ ہم اس کو اپنے مہمل شعر سنایا کرتے تھے۔ اور وہ آنکھوں کو وجد میں لاتی تھی۔ اپنے سجے ہوئے پاندان سے گلوریوں پر گلوریاں لگا کر دیتی تھی۔ یہ باتیں ہر بیوی کرتی ہوگی۔ مگر ہمارے لئے یہ باتیں بہت ہی مفرح ثابت ہو رہی تھیں۔ اکثر ہم اپنے اس اقتدار کا سکہ احباب پر بٹھانے کے لئے یہ بھی کرتے تھے۔ کہ گھر میں بیوی سے کہہ گئے کہ میں رسالہ نظر کے دفتر جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے چاء منگاؤں گا۔ تم ذرا اہتمام کے ساتھ بھیج دینا۔ رسالہ نظر کے دفتر میں پہونچے۔ امین سلونوی صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے بیوی کی قابلیت کے قصیدے پڑھے اور آخر چلنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا کہ بھئی اب میری چاء کا وقت آگیا ہے تم کو چلنا ہو تو چلو میرے ساتھ یا اگر کوئی آدمی گھر تک بھیج سکو تو یہیں چاء منگا لوں۔ امین صاحب نے فوراً اپنا آدمی بھیجدیا اور گھر سے نہایت پر تکلف چاء بغیر انتظار کے آگئی۔ اب امین صاحب کہ بھئی یہ یہ تو پوری ٹی پارٹی کا سامان ہے۔ اور ہم گویا بے پروائی سے کہہ رہے ہیں "یہی تو میں کہتا ہوں کہ بیوی ہو تو کم سے کم ایسی تو ہو بھئی میں تم سے کیا کہوں حال یہ ہے کہ صبح میں غسل کرنے کے لئے جاتا ہوں تو فوراً سوال ہوتا ہے کہ آج آپ

کون سا سوپ استعمال کریں گے۔ موسم تو پیرس کا ہے۔ یا پھر کیڈبکورا استعمال کیجیے غسل خانہ میں پہونچے تو وہاں ہر چیز سلیقہ سے موجود۔ کپڑے الگ ٹنگے ہیں۔ تولیہ الگ اسٹینڈ پر موجود، پانی کا ٹمپریچر وہ خود دیکھتی ہیں۔ میں کہتا بھی ہوں کہ آخر اس کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑا سا گرم یا تھوڑا سا ٹھنڈا ہو جائے گا تو کیا مضائقہ ہے مگر وہ ان باتوں کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ اب دیکھو یہ معمولی سی بات ہے کہ یہ جو۔ ٹی کوزی ہے۔ یہ خود ان ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ امین مرعوب ہو کر کہتے "اچھا ارے بھئی یہ تو بڑی لاجواب ہے۔ ایسی تو بھابی سے ایک مجھے بھی بنوا دو" چنانچہ دوسرے ہی دن ہم ایک ٹی کوزی حضرت گنج سے جا کر اسی نمونے کی لے آتے اور ان کو دے دیتے کہ "یہ لیجیے" میں نے جو جا کر سرکار سے عرض کیا کہ امین کو تمہاری بنائی ہوئی ٹی کوزی بہت پسند آئی ہے۔ تو پہلے تو ایک ادائے خاص کے ساتھ جھک کر سلام کیا۔ کہ میں کس قابل ہوں۔ یہ سب فیضِ صحبت ہے پھر جب میں نے کہا کہ امین نے بھی ایسی ہی ٹی کوزی کی فرمائش کی ہے۔ تو ٹھنک کر کہنے لگیں کہ اللہ اس میں ایسے کون سے لعل جڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو یونہی معمولی سی بنا دی تھی۔ میں ابھی ان کے لیے بنائے دیتی ہوں۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں یہ ٹی کوزی تیار کر کے دے دی۔ اب امین کا اعتقاد ظاہر ہے کہ کس قدر راسخ ہو گیا ہوگا۔ اسی طرح کسی دوست کو بیوی کا کلام سنا رہے ہیں۔ کسی کو بیوی کے افسانے سنا رہے ہیں کسی کو چاکلیٹ کھلا رہے ہیں۔ کہ یہ گھر ہی کا بنا ہوا ہے تمہاری بھابی نے بنایا تھا۔ اور جب وہ میکے چلی گئیں تو ہمارے تمام دوستوں کو یہ خبر تھی کہ آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے گئی ہوئی ہیں

نتیجہ یہ کہ تھوڑے ہی دنوں میں ہمارے تمام دوست اپنی اپنی بیویوں سے نہ صرف بدعقیدہ ہو گئے۔ بلکہ ہم پر رشک بھی کرنے لگے۔ کہ اس کمبخت کو دیکھو کیسی لاجواب بیوی پائی ہے۔ جو ہر فن مولا ہے۔ ممکن ہے یہ بات ہم عرض کرنا بھول جائیں کہ سعیدہ اب شوکت دلہن کے نام سے رسائل میں بھی چھپنے لگی تھیں

بیوی کی تصویر

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ ہم کو راستہ میں ایک لفافہ پڑا ہوا ملا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک تصویر تھی۔ نہایت خوبصورت اور بالوں کے انداز و لباس کی ترتیب سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی تعلیم یافتہ لڑکی کی تصویر ہے۔ اس تصویر کو ہم نے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اور اب جو احباب کے سامنے پرس کھولتے ہیں تو تصویر سامنے ہی تھی۔ یہ سب شیطان "بیوی کی تصویر، بیوی کی تصویر" کہہ کر لپکے ہماری طرف۔ اور ہم نے تصویر کو چھپانے کی بظاہر بہت کوشش کی۔ آخر ان حضرات نے تصویر چھین کر خوب خوب دیکھی۔ مختلف ریمارکس پاس ہوئے۔ کسی نے کہا کہ یار ایسی بیوی پاکر تو کبھی خود بھی آئینہ دیکھتا ہے۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ، ایک صاحب نے رائے دی کہ میاں تم ایک ماہر نقال ہو بیوی کو لے کر اگر بمبئی چلے جاؤ تو کسی فلم کے لئے تم اور وہ دونوں معقول معاوضہ پر رکھ لئے جاؤ گے۔ مختصر یہ کہ وہاں تو سب کو یقین کہ یہ بیوی کی تصویر ہے۔ اور ہم نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار بلکہ اس طرح چپ ہیں کہ گویا اب تو تم لوگوں نے تصویر دیکھ ہی لی۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں جب ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے تو سراج احمد صاحب

ہمارے ساتھ ہو لیے کہ تم سے ایک کام ہے۔ اور جب دور نکل آئے۔ تو اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "یہ تصویر کہاں ملی تھی تم کو؟"

ہم نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟"

کہنے لگے "یوں ہی پوچھتا ہوں"

ہم نے بتا دیا "الیاس کے مکان کے سامنے۔ یہ لفافہ پڑا ہوا تھا میں نے اٹھا لیا۔"

کہنے لگے کمال ہو گیا۔ میری کتاب سے نہ جانے کس طرح نکل گیا۔ بھابی جان کی تصویر ہے اور آپ نے سب سے کہہ دیا کہ میری بیوی کی تصویر ہے سبحان اللہ لائیے تصویر مجھے دیجیے۔"

ہم نے تصویر دیتے ہوئے کہا "مجھ پر آپ الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے یہ کب کہا کہ یہ میری بیوی کی تصویر ہے۔ بلکہ میں تو اسی لیے چھپا رہا تھا۔ یہ تو ان ہی لوگوں نے کہا کہ یہ میری بیوی کی تصویر ہے اور آپ وہاں کیوں خاموش رہے؟"

سراج نے کہا "ماشاءاللہ تو گویا میں سب سے یہ کہہ دیتا کہ بھابی جان کی تصویر ہے تاکہ سب مذاق اڑاتے۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا ہو گیا۔ مگر اب آپ لطیفہ کے طور پر یہ قصہ نہ لے بیٹھیے گا کہیں۔"

ہم نے وعدہ کر لیا کہ کسی سے نہ کہیں گے چنانچہ اس وقت لکھنے کے علاوہ آج تک کسی سے نہیں کہا۔ اور اب لکھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ سراج کی بھابی جان نے اب پردہ بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اور سعیدہ بھی بے پرد

ہو چکی ہیں۔ اب سب کو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ تصویر کس کی تھی۔ ہماری بیوی یا سراج کی بھابی جان کی۔

مولانا آسی

اسی زمانہ میں امین سلونوی صاحب نے ہم کو ایک شعر سنایا ؎

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

معلوم نہیں اس شعر میں وہ کونسی بات ہے کہ آج بھی اسے یاد کر کے تقریباً وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس شعر کو پہلی مرتبہ سن کر طاری ہو گئی تھی بار بار ہم نے اس شعر کو سنا اور بار بار امین صاحب نے سنایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شعر مولانا عبدالباری آسی کا ہے جن کے متعلق امین صاحب ہم کو کئی بار یہ مشورہ دے چکے تھے کہ اگر تم شعر کہتے ہو تو کسی کو دکھا بھی لیا کرو۔ اور سب سے اچھا یہ ہو کہ مولانا آسی سے مشورہ لے لیا کرو۔ اب تک تو خیر ہم ٹال جاتے تھے مگر آج یہ شعر سن کر ہم نے امین صاحب سے عرض کیا کہ ہم کو مولانا آسی کے پاس لے چلو۔ مولانا آسی سے اپنی ملاقات کا ذکر ہم نے شیش محل جلد اول میں کیا ہے۔ اور یہاں بھی اسی کی کچھ تکرار ہو رہی ہے۔ امین صاحب کے ساتھ ہم مولانا آسی کے در دولت پر حاضر ہوئے کبوتروں ڈھابلیوں سے لبریز صحن کو عبور کر کے ہم لوگ ایک دالان میں پہنچے۔ جہاں ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ ایک نہایت ضعیف العمر ساتھی کے ساتھ بیٹھے شطرنج میں مشغول تھے امین صاحب

نے جاتے ہی کہا، "السلام علیکم مولانا"

مولانا نے فرمایا، "گھوڑا دیکھیے یا رُخ۔ وعلیکم السلام تشریف رکھیے"

اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مولانا بازی جیت گئے۔ تو ایمن صاحب نے تعارف کی رسم ادا کی اور ہم نے تعارف کے بعد مولانا سے ان کے اسی شعر کے متعلق عرض کیا کہ مجھ پر آج تک کسی شعر کا کبھی اتنا اثر نہیں ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا مکمل شعر آج میں نے سنا ہے۔۔ مولانا اس سلسلے میں مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ اور جب ایمن سلونوی صاحب نے ہم کو مولانا کی شاگردی میں پیش کیا تو مولانا نے از رہِ شفقت ہم کو قبول کر لیا۔

مولانا آسی کی علمی قابلیت اور شاعرانہ صلاحیت ہم پر روز بروز واضح ہوتی گئی۔ اور آج بھی اس سلسلہ میں ہم مطمئن ہیں۔ کہ ہمارا استاد واقعی اپنے فن کا ایک مشاق فن کار ہے۔ اور اس کا شاعرانہ مرتبہ یقیناً بہت بلند ہے مولانا آسی کے مشورے نے تھوڑے ہی دنوں میں شعر کہنے، سمجھ کر کہنے اور کہہ کر سنانے کے قابل بنا دیا۔ اب تک ہم شعر تو کہا کرتے تھے مگر نہ جانے کیا کہتے تھے یا بکا کرتے تھے مگر اب باقاعدہ شعر گوئی شروع کر دی۔ اور مشاعروں میں پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں تک اپنے استاد کے بل بوتے پر شاعر بنے رہے۔ آخر خود رینگنا۔ پھر چلنا۔ اور اس کے بعد دوڑنا شروع کر دیا۔ اب بھی مولانا آسی اتنی نگرانی ضرور رکھتے ہیں کہ کہیں ان کا بڑھایا ہوا قدم ٹھوکر نہ کھا لے۔ تفصیلی طور پر مولانا آسی کا ذکر تشنگیٔ تکمیل میں آ چکا ہے۔ اور یہاں چونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا یہی اجمال کافی ہوگا۔

مشاعرے

مولانا آسی سے مشورۂ سخن لینے کا سب سے پہلا نتیجہ تو یہ نکلا اب مشاعروں کی شرکت باقاعدگی کے ساتھ شروع کر دی لکھنؤ میں مشاعروں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ سوائے محرم کے یہاں مشاعرے بے قید موسم ہمیشہ ہوا ہی کرتے ہیں شاید ہی کوئی منحوس دن ایسا گزرتا ہو۔ جب شہر میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی بزم سخن گرم نہ ہوتی ہو۔ اور مولانا کا مشورہ یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مشاعروں میں شرکت کرو۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ہم نے بے شمار مشاعرے پڑھ ڈالے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مشاعرہ باز حضرات ہمارے پاس شرکت کے وعدے لینے ہر طرف سے آنے لگے۔ آواز اچھی تھی۔ پڑھنے کا طریقہ دلنشیں تھا۔ لہٰذا مشاعروں میں خوب خوب اچھلے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی بلگرامی صاحب نے تو ہم کو اپنا مستقل گراموفون ہی بنا لیا تھا کہ ہم سے ہر مشاعرے میں غزل پڑھواتے تھے اور خود سلام کرتے تھے۔ دراصل ہم نے سب سے پہلے جس مشاعرے میں شرکت کی ہے وہ انجمن معین الادب لکھنؤ کا مشاعرہ بجانب وصل بلگرامی تھا اور طرح تھی

ع۔ پردہ جو اٹھاتا ہوں پردہ نظر آتا ہے

وصل صاحب نے اسی مشاعرے میں اپنی غزلیں پڑھوانے کے لئے گویا اس خاکسار کا انتخاب کر لیا تھا۔ اور آخر میں تو اللہ بخشے مرحوم ایک مستقل عذاب بن کر رہ گئے تھے۔ اکثر مشاعروں میں یہ بھی ہوا کہ ہم نے اپنی غزل پڑھی۔ دو ایک اور غزلیں پڑھیں اور پھر وصل صاحب کا دو غزلہ سہ غزلہ، وہ بھی کسی غزل میں

پچیس تیس شعر سے کم نہیں کہتے تھے۔ اور ہر شعر کے متعلق سامعین سے ان کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ بار بار پڑھوانے پر اصرار کریں۔ چنانچہ وہ ہمارے پاس بیٹھ کر سلام کرتے جاتے تھے اور چپکے چپکے کہتے جاتے تھے "پھر پڑھو، پھر پڑھو" بات یہ تھی کہ وہ خود غزل میں ڈوبیں یا نہ ڈوبیں مگر ہمارا بیڑہ غرق کرنے کی قسم کھا چکے تھے ایک آدھ مرتبہ خود وصل صاحب کو اپنا کلام خود بھی پڑھنا پڑا اور اس کیفیت کو ہم کبھی الفاظ میں بیان ہی نہ کرسکے۔ جو وصل صاحب کے خود پڑھنے سے پیدا ہوتی تھی کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا میں چار پاگل کتے لڑ رہے ہیں یا منڈی کے کنجڑوں میں کسی بات پر تکرار ہو گئی ہے۔ یا پاگل خانہ کے کسی کمرے میں کچھ پاگل آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ غزل پڑھتے وقت ان کے گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں آنکھیں خون برساتی تھیں۔ منہ سے جھاگ اڑتا تھا آواز میں کچھ بم، کچھ ٹینک کی گھڑگھڑاہٹ، کچھ ریڈیو کی فضائی خرابیاں کچھ رعد کی کیفیتیں سب مل جل کر وہ بات پیدا کر دیتی تھیں۔ جس کو سوائے عذاب الٰہی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سامعین اس غزل کو سن کر تھوڑی دیر تک خدا سے اپنے گناہوں کی توبہ کرلے کے بعد اس قابل ہو سکتے تھے کہ کسی اور کا کلام بھی سنیں اور سمجھیں ڈر کے مارے داد تو سب ہی کو دینا پڑتی تھی۔ مگر وصل صاحب کی غزل سرائی بھی دنیا کی کسی بیداد سے کم نہ تھی غالباً وہ خود اس ادبی ورزش سے تنگ تھے۔ اور واقعی ان کا غزل پڑھنا پوری غزل کی ولادت ہوتی تھی۔ یا تو اس تکلیف سے بچنے کے لئے یا اپنی غزل کی خوفناکیت کو کم کرنے کے لیے یعنی سامعین کو ڈرا دھمکا کر داد دینے کے بجائے وہ یہ چاہتے ہوں گے کہ غزل دلچسپی سے سنی جائے۔ اور لوگ اس پر خوش ہو کر داد دیں۔ کچھ بھی ہو وصل صاحب

کے اس معمول نے ہم کو مشاعروں سے بیزار کر دیا تھا کہ آخر لوگ کیا سمجھتے ہوں گے کہ وصل صاحب اپنا نوحہ گر ساتھ رکھتے ہیں۔ لاکھ لاکھ بچنے کی کوششیں کرتے، مشاعروں سے بھاگتے، وصل صاحب سے منہ چڑاتے مگر توبہ کیجیے۔ وصل صاحب کے کاٹے کا منتر ہی نہ تھا۔ وہ غزل پڑھنے کا حکم دے دیتے تھے اور ہم تعمیل کے لئے گویا مجبور تھے۔

مین پوری کے مشاعرے

ہمارے خسر محترم مولوی سجاد حسین صاحب قبلہ نے اپنے داماد کو بحیثیت شاعر کے اہل مین پوری کے سامنے پیش کرنے کے خیال سے پہلے وہاں کی مقررہ طرحوں پر ہم سے غزلیں منگائیں۔ اس کے بعد ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے خود ہم کو طلب کر لیا۔ اسی مشاعرے میں سب سے پہلے حضرت جگر مرادآبادی اور جناب فانی بدایونی سے ملاقات ہوئی۔ جگر صاحب بہت ہی خصوصیت کے ساتھ ملے۔ اور پھر جب تک ہم مین پوری میں رہے جگر صاحب کا ساتھ نہ چھوٹا۔ فانی صاحب دوسرے ہی دن آگرہ چلے گئے۔ مگر اسی مختصر ملاقات میں بہت ہی خصوصی تعلقات ان سے بھی قائم ہو گئے۔ مین پوری کے مشاعرے میں دو انمول جواہر اور بھی ملے۔ یعنی بہاری چرن صاحب صادق اور تربینی سرن شاد۔ ان دونوں سے آج تک برادرانہ تعلقات ہیں۔ آج کل یہ حضرات بھوپال میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اور حال یہ ہے ان دونوں کا کہ بھوپال جا کر ہم اپنے بھائی جان ارشد تھانوی صاحب کے یہاں اس لئے ٹھہر نہیں سکتے کہ وہاں بہاری چرن صادق اور تربینی سرن شاد بھی رہتے ہیں۔ مین پوری کے ان مشاعروں

میں مولوی سجاد حسین صاحب قبلہ خود ہم کو لے جاتے تھے۔ وہ مشاعرے کی صدارت کرتے تھے۔ اور ان کے زیر صدارت جس وقت ہم غزل پڑھتے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ گویا ان ہی کا کلام پڑھا جا رہا ہے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ ہمارے کسی شعر پر سامعین کی داد سن کر سلام کرنے لگیں۔ کہ آداب غرض یہ اسی خاکسار کا خویش ہے۔

پہاڑ پھٹ پڑا

ہم ان ہی رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہ آج بنارس کا مشاعرہ ہے تو کل گورکھپور کا مشاعرہ آج یہ اردو کانفرنس ہے تو کل وہ مناظرہ آج یہاں نظم پڑھنا ہے تو کل وہاں پیپر سنانا ہے کہ یکایک والد صاحب پھر بیمار پڑ گئے۔ پھر آپریشن ہوا میڈیکل کالج میں داخل اور وہاں جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو گھر ہی پر کیپٹن ڈنکم سے آپریشن کرایا۔ مگر مرض کسی طرح قابو میں نہ آسکا۔ ایک شکایت دور ہو جاتی تھی اور دو نئی شکایتیں پیدا ہو جاتی تھیں اسی زمانہ میں ڈاکٹر محمد عمر صاحب ہمارے خالہ زاد بھائی اور مولوی سجاد حسین صاحب کے برادر عزیز لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے۔ غالباً پوسٹ گریجویٹ کورس کے لئے۔ آپ نے والد صاحب کا معائنہ کر کے بتا دیا تھا۔ کہ اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ پیشاب میں گردوں سے چربی اس قدر نکل چکی ہے کہ اب کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ہر ممکن طریقہ پر بہتر سے بہتر علاج ہوا۔ دن میں چار چار اور پانچ پانچ ڈاکٹر آئے ایک مرتبہ چھ ڈاکٹروں نے ایک ہی وقت میں دیکھ کر باہمی مشورہ سے علاج کیا مگر دقت

آچکا تھا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۷۸ء کو رائے بہادر کنور بھیم بہادر شاہ اور حکیم خواجہ کمال الدین صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے آئے تو آپ بہت بشاش تھے ہنسی مذاق ہوتا رہا اور آخر میں آپ نے رائے صاحب سے کہا۔ کہ ان لوگوں کو نہ معلوم کیا ہو گیا ہے یہاں چل چلاؤ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا پروگرام بدلنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں دوستوں نے سمجھایا مگر آپ ہنستے ہی رہے۔ گویا ان جھولی ٹتلیوں کا مفہوم سمجھتے رہیں۔ ان حضرات کے رخصت ہونے کے بعد ہمارے ایک عزیز سے کہا۔ میاں قرآن مجید پڑھ کر سناؤ وہ دیر تک کلام پاک پڑھتے رہے۔ اور آپ آنکھیں بند کئے سنتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ یہ سمجھے کہ سو گئے ہیں۔ لہذا وہ خاموش ہو گئے۔ اور وہاں سے چلے گئے آپ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور ہم سے کہا تم ہی کچھ پڑھ کر سناؤ۔ لو یہ عہد نامہ رکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤ میں نے عہد نامہ پڑھ کر سنایا۔ پھر آنکھیں بند کرکے خاموشی سے سنتے رہے۔ اور جب میں خاموش ہو گیا تو پھر کچھ نہ بولے۔ واقعی سو گئے تھے میں بھی بخار میں مبتلا تھا۔ لہذا اسی کمرہ میں ایک طرف لیٹ گیا کہ دیکھا یک دریچے کے قریب وہ ایک دم الجھ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگے اور اسی وقت سانس حلق میں اٹکنے لگی۔ ماموں صاحب کو دوسرے کمرے سے بلانے دوڑا تو فرمایا "بیٹا سنبھل کے" اور بس روح پرواز کر گئی۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ والدہ صاحبہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ خود ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سر کے اوپر سے آسمان اور پیر کے نیچے سے زمین ہٹ گئی۔ اب ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ تمام آرائشیں یہ تمام بیٹھکیاں اور یہ تمام ریاستیں ایک دم ہم سے منہ موڑ گئیں۔

فکرِ معاش

عشقِ بتاں کا دور گیا۔ فکرِ معاش کے دن آگئے۔ والد صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی ہم کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس پوری شدت کے ساتھ ہوا۔ اور ہم نے بجائے گھبرانے یا ہاتھ پیر ڈال دینے کے ایک عزم بالجزم کے ساتھ کمر باندھ لی اور ماموں صاحب سے کہا کہ اگر آپ ہم کو کہیں کسی تنخواہ کی کوئی ملازمت دلوا سکیں تو دیر نہ کیجئے۔ ماموں صاحب ہماری طرف سے ایک حد تک مایوس تھے اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ پڑھے نہ لکھے اور نام محمد فاضل، وہ بیچارے اس شش و پنج میں مبتلا ہوگئے کہ ان حضرت کے لئے ملازمت آخر کس قسم کی ڈھونڈھی جائے۔ لکھے پڑھے ہوتے تو خود ان کے باپ کے بہت سے دوست تھے اور سب کے سب اعلیٰ عہدوں پر مگر اب کسی سے کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ وہ تو سوچتے ہی رہے مگر ہم نے اپنے لئے ایک جگہ تجویز کرلی اور ان سے کہا کہ مجھ کو خان بہادر سیّد احمد حسین صاحب رضوی کے پاس لیکر چلئے۔ وہ ہم لوگوں کے عزیز بھی ہیں اور آج کل روزنامہ ہمدم کے منیجنگ ڈائرکٹر ہیں وہ اگر مجھ کو ہمدم کے عملہ میں لے لیں گے۔ تو میں معمولی سی تنخواہ پر بھی کام شروع کردوں گا یہ کام میری مرضی کا ہوگا اور اس میں خود ترقی کروں گا ماموں صاحب ان باتوں کے قائل تو نہ ہوئے مگر ہم کو لیکر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس گئے۔ سید صاحب نے پوری عزیز دارانہ ہمدردی فرمائی۔ اور ہم کو اسی وقت ایک پروانہ تقرری دیدیا کہ اسے لیکر سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سے کل ملنا وہ تم کو مناسب کام دیدیں گے۔ فی الحال تنخواہ چالیس روپیہ ماہوار رہی۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کرو۔

دفتر روزنامہ ہمدم

دوسرے دن ہم روزنامہ ہمدم کے دفتر پہونچے۔ سید جالب دہلوی کا پتہ پوچھ کر ایک ایسے کمرہ میں پہونچے جہاں ایک لمبی سی میز پر چاروں طرف چار آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ اور ایک پانچویں بزرگ ایک علیحدہ میز پر اخباروں کے ڈھیر کے درمیان کاغذ پر جھکے ہوئے نہایت تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ترکی ٹوپی سے آپ شرع ہوتے تھے جس کا پھندنا آگے پڑا ہوا تھا۔ اور سر کے سفید بالوں کا ایک جھوجھ ٹوپی کے آگے پیشانی پر گویا ٹوپی سے بغاوت کر کے نکل آیا تھا۔ بے ترتیب سی داڑھی کاغذ سے کچھ ہی فاصلہ پر قلم کی جنبشوں کے ساتھ حرکت کر رہی تھی۔ اور کرسی کے نیچے دونوں ٹانگوں کے درمیان ازار بند زمین تک لٹکتا چلا گیا تھا۔ کہ آپ بیٹھے بیٹھے اونگھ گئے ہیں اور ہم دیر تک آپ کی توجہ کے امیدوار بنے کھڑے رہے۔ آخر آپ نے دس منٹ کے بعد زیر قلم صفحہ ختم کرتے ہوئے ایک نعرہ بلند کیا "لے جاؤ" اور دزدیدہ نظر سے اس خاکسار کو دیکھا

ہم عرض کیا "السلام علیکم"

نہایت بیزاری سے "وعلیکم السلام" اس طرح فرمایا گویا کہہ رہے ہیں کہ "تو خود السلام علیکم"

ہم نے خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کا خط پیش کر دیا جس کو پڑھ کر آپ نے ہم کو پہلے تو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک ہی سانس میں ہمارے خاندان کی پوری تاریخ ہم کو اس طرح سنا دی گویا آپ خود اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ ہم حیرت سے سنتے رہے۔ اور وہ فرماتے رہے۔

،،آپ کے سب سے بڑے چچا حبیب احمد صاحب غالباً اس وقت ولایت تشریف لے گئے تھے جب آپ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ وہ پھر وہاں سے واپس تشریف نہیں لائے۔ آپ کو غالباً اطلاع ہو گی کہ وہ سیاست کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اور ان کی ادبی اور صحافی اہلیت مسلّم سمجھی جاتی تھی ہر چند کہ وہ خود پولیس کے اعلیٰ عہدیدار تھے۔ مگر ان کی صحافی دلچسپیاں پھر بھی کسی نہ کسی صورت سے کارفرما نظر آتی تھیں۔ آپ کے سب سے چھوٹے چچا منشی فیاض احمد صاحب دہلی سے ایک روزنامہ اخبار نکالتے تھے۔ اور مجھ کو صحافت کا سب سے پہلا درس وہیں سے ملا ہے۔ آپ کے والد کو البتہ اخبار نویسی یا ادب کے کسی شعبہ سے براہِ راست کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور نہ غالباً آپ کے دوسرے چچا منشی سلطان احمد صاحب کو کوئی دلچسپی تھی مگر ان کے صاحبزادے یعنی ان کے چچا زاد بھائی ارشد تھانوی صاحب تو شاعر بھی ہیں اور نہایت اچھے انشاء پرداز بھی ہیں بہر صورت بہت خوش ہوں کہ آپ نے بھی اپنے لئے اسی میدانِ عمل کو پسند کیا ہے۔ پیر احمد حسن صاحب آپ کا تقرر کر ہی چکے ہیں۔ میں آپ کو اس اخبار کے منیجر قاضی محمد حامد صاحب حسرت کے پاس بھیجتا ہوں وہ آپ کو آپ کے فرائض کی نوعیت وغیرہ بخوبی سمجھا دیں گے۔" اس تمام گفتگو میں ہم کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ سید صاحب نے کہیں سانس بھی لی یا نہیں۔ اور نہ کسی لفظ کے درمیان کوئی فصل تھا۔ معلوم یہ ہوتا کہ الفاظ کی ایک زنجیر ہی جو منہ سے نکلتی چلی آرہی ہے البتہ آواز کی جھر جھراہٹ سے یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ حلق میں کوئی دیسی قسم کا ساؤنڈ بکس لگا ہوا ہے جس پر استعمال کی ہوئی سوئی لگا دی گئی ہے۔ اور ہماری خاندانی روایات کا جو ریکارڈ کثرتِ استعمال سے گھس چکا ہے۔ گراموفون کے اس سب سے پہلے

ماڈل پرنچ رہا ہے۔ سید صاحب نے اپنی تقریر ختم کر کے کچھ لکھا اور آواز دی۔ ے جاؤ۔ دفتر کا ایک ملازم آیا تو اس کو وہ پرچہ دیکر ارشاد فرمایا کہ آپ کو قاضی صاحب کے پاس لے جاؤ۔"

قاضی محمد حامد صاحب حسرت ہمدم کے منیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی آپ کا کمرہ سید جالب صاحب کے کمرہ سے زیادہ شاندار تھا۔ اور سلیقہ بھی کافی نظر آرہا تھا۔ قاضی صاحب ہم سے اس طرح ملے گویا پہلے سے واقف تھے۔ اور آپ نے بغیر کچھ دریافت کئے اپنے ہی کمرہ میں ہمارے لئے ایک علیحدہ میز لگوادی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی نے قاضی صاحب کو کل ہی بلا کر ان سے کہہ دیا تھا کہ شوکت تھانوی میرے عزیز ہیں۔ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔ امید ہے کہ یہ کام کے آدمی ثابت ہوں گے بہر صورت ان کے متعلق مجھے پندرہ روز کے بعد رپورٹ کی جائے۔ اس لئے کہ باوجود عزیزداری کے میں یہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ ہمدم کے ذریعہ کنبہ پروری کروں۔ قاضی صاحب کے لیے یہی اشارہ کافی تھا۔ لہذا آپ بہت ہی مہربانی کے ساتھ پیش آئے۔ اور سب سے پہلے ہم کو یہ کام بتایا کہ آپ ہمدم کے دو مہینے کے فائل لے کر تمام مقالات افتتاحیہ اور شذرات پڑھ ڈالئے۔ تاکہ آپ کو حالات حاضرہ کے علاوہ ہمدم کی پالیسی کا اندازہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ سے کوئی تحریری کام لیا جا سکے گا۔ ہم نے ہمدم کے فائل نہایت غور سے پڑھنا شروع کر دیئے دفتر میں بھی پڑھتے تھے۔ اور گھر بھی لے آتے تھے پڑھنے کے لئے۔ آخر تین دن میں ہم نے دو مہینے کے فائل پڑھ ڈالے۔ مقالات افتتاحیہ کو پڑھا۔ شذرات پر نظر ڈالی اور مزاحیہ کالم دو دو باتیں بھی پڑھ ڈالیں۔ اب قاضی صاحب نے ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات

لکھوانا شروع کیے اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا۔ خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیج دیئے جاتے تھے۔ ابوزاہد سید جالب صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ عبارت طاری ہو کر رہ جاتی تھی۔ اور کاغذ کو دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ گویا روس کی سرخ فوج نے حبش پر حملہ کر دیا ہے۔ اور روس کے سرخ سپاہی حبشیوں کو چھاپ بیٹھے ہیں شروع شروع میں تو حال یہ تھا کہ ہمارے شذرے کا شاید ہی کوئی لفظ سید صاحب کی سرخ روشنائی سے بچتا ہو مگر رفتہ رفتہ قتل عام کم ہوتا گیا۔ اب ہر سطر میں کچھ سرخ نشانات نظر آنے لگے۔ اس کے بعد ہر دو تین سطروں کے بعد کچھ سرخ چھینٹیں نظر آتی تھیں مگر یہ تو ارمان ہی رہ گیا کہ ہمارا کوئی شذرہ سید صاحب کے ملاحظہ سے گزر کر بغیر اصلاح کے آجائے۔ سید صاحب کی بعض اصلاحیں ہماری سمجھ میں نہ آتی تھیں مگر ہم چپ رہتے تھے۔ آخر ایک دن ہم نے دیکھا کہ ہمارے ایک سب لیڈر میں صرف ایک اصلاح ہے یعنی ہم نے لکھا تھا "نقطہ نظر" اور آپ نے اس کو کاٹ کر اوپر لکھ دیا۔ زاویہ نظر" اب ہم سے ضبط نہ ہو سکا اور ہم وہ سب لیڈر لے کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اور ان سے عرض کیا "میں یہ سمجھا نہیں کہ آپ نے نقطہ نظر کاٹ کر زاویہ نظر کیوں بنا دیا ہے۔ میرے نزدیک تو کوئی ایسا فرق ان دونوں میں نہیں ہے" سید صاحب نے اسی طرح نہایت بے پروائی سے بغیر سانس لئے فرمایا بہت بڑا فرق ہے۔ نقطہ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ جو بات آپ کہہ رہے ہیں۔ اس کی اصلیت پر آپ کی نگاہ تیقن کے ساتھ پہنچ چکی ہے اور اب اس میں آپ کے نزدیک کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ اور زاویہ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی نظر اس نقطہ کے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ یعنی وہ بات جو آپ ذمہ داری صرف

اسی بات کی لیں جس کے متعلق آپ کو واقعی یقین ہو کر جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جہاں تک بحث کے پہلو کسی ذمہ داری کے سلسلہ میں آپ نکال سکتے ہوں نکالیں۔ زاویہ نظر لکھ کر آپ نے ذمہ داری تو لے لی مگر بحث کی ایک صورت بھی اپنے لئے محفوظ کر لی۔ اور نقطہ نظر لکھ کر یہ ہوگا کہ ذمہ داری تو آپ لے لیں گے مگر بحث کا کوئی امکان نہ ہوگا۔" سید صاحب کا نکتہ ہمارے ذہن میں اتر گیا اور اب تک اصلاحوں کے سلسلہ میں جتنی شکایتیں ہمارے دل میں تھیں سب دور ہوگئیں۔

سید صاحب نے کچھ ہی دنوں کے بعد ہم سے کہا کہ آپ مزاحیہ کالم "دو دو باتیں" بھی لکھا کیجئے۔ لہذا ہم نے یہ کوشش بھی کی اور اس سلسلہ میں بڑے خوش نصیب ثابت ہوئے کہ سید صاحب جن کے متعلق تمام عملہ کو یہ شکایت تھی کہ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے، "دو دو باتیں" دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ میں نے یہ فیصلہ آپ کے شذرات اور سب لیڈر وغیرہ دیکھ کر کیا تھا۔ اس لئے کہ آپ کی سنجیدہ تحریروں میں جو شگفتگی ہوتی تھی۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اگر آپ مزاحیہ کالم لکھیں تو اپنی اس شگفتگی سے زیادہ کام لے سکیں گے۔ دراصل مزاح لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے بلکہ میں تو اس کو اس حیثیت سے بہت ہی بڑا درجہ دیتا ہوں کہ ایک مزاح نگار کو نہایت باریک پگڈنڈی پر چلنا پڑتا ہے۔ اس طرف ذرا سا ہٹ جائیے تو استبدال اور پھکڑپن کر رہ جاتا ہے۔ مزاح اور اس طرف ذرا سا ہٹ جائیے تو سنجیدہ بن جاتا ہے۔ دراصل اس کے لئے قدرتی طور پر بعض طبائع ہوتے ہیں۔ اور میرا خیال درست نکلا کہ آپ مزاح نگاری میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔" سید صاحب کی طرف سے اس حوصلہ افزائی کے بعد ہم نے ہمدم کا یہ کالم اپنے ذمہ لے لیا۔ اور مستقلاً دو دو باتیں لکھتے رہے یہاں تک

کہ پنجاب کے اخباروں نے ہمدم کے "دور دور باتیں" لکھنے والے کو اپنے کالموں میں "باتونی" کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

سید صاحب سے اب روز بروز قرب حاصل ہو رہا تھا پہلے ہم ان کے شاگرد تھے، پھر ماتحت ہوئے اور اب وہ ہم کو اپنا خورد سمجھنے لگے تھے۔ مگر اتنی مجال اب بھی نہ تھی کہ ہم ان سے کسی معاملہ میں بحث کرتے۔ دوسرے ڈرتے بھی تھے کہ اگر کوئی بات پوچھ بیٹھے تو پھر یہ اسی وقت بات بتائیں گے، بات کی جڑ بتائیں گے اور بات کے پھول پتے تک سب بتا جائیں گے۔ کسی قسم کی کوئی بات ہو، کسی فن سے متعلق، شاعری، زردوزی، معماری، ڈاکٹری، مصوری، موسیقی، خیاطی غرض تو کیا کہ دنیا کے کسی شعبہ کو لے لیجئے اور سید صاحب سے کسی بات کے متعلق کچھ پوچھ لیجئے، بس آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اور جب تک اس بات کے سلسلہ میں آپ میں ڈاکٹریٹ کی قابلیت پیدا نہ کر دیں گے تالو سے نہ زبان لگائیں گے۔ نہ سانس لیں گے۔ غلطی سے پوچھ لیا کہ سید صاحب آپ یہ حقہ کسی خاص اہتمام سے بھرواتے ہیں یا جس تمباکو کا ہو۔ اور جس طرح چاہے بھر دیا جائے۔ آپ پی لیتے ہیں۔ لیجئے سید صاحب شروع ہو گئے کہ جی ہاں حقے کے سلسلہ میں میری پسند تو خاص کوئی بھی نہیں ہے۔ مگر میں لکھنؤ کے خمیرے میں گورکھپور کا تمباکو ملا کر زیادہ پسند کرتا ہوں۔ دراصل میں بچپن ہی سے حقہ کے مرض میں مبتلا ہوں۔ والد صاحب میرے لئے میرٹھ کی نوچندی سے ایک خوبصورت سی گڑگڑی ہر سال لایا کرتے تھے۔ اور میں اسی کو بستر میں لیا کر استعمال کرتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ اہتمام ختم ہو گیا اور حقہ کے سلسلہ میں میں نے جب غور کرنا شروع کیا تو عظیم اللہ خانی حقے سے لے کر لکھنؤ کے حقے تک سب ہی کا مزہ چکھا اور آخر میں اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ خالص حقہ پنجاب کے لوگ پیتے ہیں ان کی تمباکو

میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی میں نے پنجاب کی اس تمباکو کو گنڈے کی آگ رکھ کر پیا ہے اور میری رائے یہ ہے کہ حقے کے لئے سب سے بہتر آگ گنڈے کی ہوتی ہے جس کی آنچ میں ایک قسم کا توازن ہوتا ہے۔ اور تمباکو ایک دم بھڑکنے یا قبل از وقت بجھنے نہیں پاتی۔ یہ سٹک وغیرہ تو دراصل امراء کے تکلفات ہیں۔ حالانکہ طبی حیثیت سے سٹک کا استعمال یوں بھی مفید ہے کہ دھواں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرکے آتا ہے۔ دوسرے پھیپھڑوں کے لئے ایک قسم کی ورزش کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے"۔ اب کہاں تک اس سلسلہ میں لکھا جائے۔ سید صاحب اسی حقہ کے سلسلہ میں نظام سقہ کے حقے سے لے کر ڈیو جانس کلبی کے حقے تک پہونچ کر بھی دم نہ لیتے۔ حقے کے تمام اقسام نیچوں کی ساخت چلموں کی قسمیں۔ تمباکو بنانے کے مختلف طریقے۔ ہر قوم میں حقے کی جداگانہ روایات حقے کے بعد سگریٹ کی ایجاد اور اس کی ضرورت پائپ اور سگار مختصر یہ کہ سب ہی پر روشنی ڈالتے اور مختلف تمباکو فروشوں کے شجرے پیش کرتے چلے جاتے تھے۔ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان حضرت نے زندگی بھر حقے ہی کے متعلق تحقیق و تفتیش کی ہے۔ مگر نہیں ان سے تو جس موضوع پر بھی گفتگو کیجئے۔ اسی ہمہ دانی کا قائل ہونا پڑتا تھا۔ دفتر میں ہر روز نہ جانے کتنے لوگ آپ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اور آپ ان میں سے ہر ایک کے خاندان سے اس قدر واقف نکلتے تھے۔ کہ شاید وہ لوگ خود بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ نہایت وثوق سے کہہ دیا کرتے تھے کہ "جی ہاں آپ کو نہیں معلوم ہے کہ آپ کے والد محترم کے عم محترم کی خالہ صاحبہ محترمہ کے پاندان کی تمباکو دانی کی کلھیا سے یہ تعویذ برآمد ہوا تھا۔ دراصل یہ تعویذ خان خاناں بیرم خاں سے ہوتا ہوا راجہ ٹوڈرمل کے پوتے کے پاس پہونچا۔ اور وہاں سے میر مہدی مجروح کے خسر محترم میر گھسیٹے کے پاس آیا جو یہ

تعویذ مدتوں غائب رہا۔ اور آخر کار جمنا کے کنارے بمقام کالپی ایک خزانہ عبداللہ نامی ایک نعل بند کو ملا۔ اس نے آپ کے والد محترم کے عم محترم کی خالہ محترمہ کے شوہر۔ شوہر امانت علی خاں صاحب کو وہ تعویذ دے دیا تھا۔ اور اس طرح آپ کے خاندان تک یہ تعویذ آیا۔" اب وہ حضرت اور باقی تمام سامعین حیران رہ جاتے تھے۔ کہ سید صاحب کو آخر یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ اسی طرح وہ ہر بات اور ہر روایت سے اس قدر باخبر تھے کہ ان کو زندہ انسائیکلوپیڈیا کہنا غلط نہ ہوگا۔ افیون کا شوق فرماتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اپنے کو رندِ مشرب کہا کرتے تھے۔ سید صاحب کی کچھ دنوں کے بعد منتظمین سے ان بن ہوگئی اور آپ ہمدم سے علیحدہ ہوگئے۔ اس موقع پر سید صاحب کو عملہ نے ایک رخصتی پارٹی دی۔ چنانچہ فوٹو گروپ کے لئے سید صاحب نے خاص طور پر اہتمام سے صاف کپڑے پہنے۔ اور سیاہ شیروانی زیب تن فرمائی۔ مگر اسی سج دھج کے ساتھ یعنی اوپر کے تین بٹن بند باقی سب کھلے ہوئے ہاتھ میں چھڑی، اور چھڑی اور ہاتھ کے بیچ میں ایک بڑا سا رومال، ڈوری دار سیاہ جوتا مگر ڈوریاں کھلی ہوئی۔ میں نے عرض کیا سید صاحب جوتے کی ڈوری تو باندھ لیجئے۔ اس کا جواب آپ کے صاحبزادے عشرت صاحب نے دیا کہ "حاجت مشاطہ نیست" میں نے کہا "روئے دلارام" کبھی تو کہئے۔ سید صاحب نے کہا "ہمارے میاں عشرت جو جی میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں" سید صاحب کے متعلق زیادہ تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ میں ایک مستقل مضمون سید جالب دہلوی لکھ چکا ہوں اور شگوفہ میں کبھی سید صاحب سے لوگ مل چکے ہوں گے۔

سید جالب دہلوی کے بعد ہمدم کی ادارت ایک ہفتہ تک ملک نصراللہ خاں

یز سابق مدیر، مدینہ بجنور نے فرمائی۔ آپ کے بعد قاضی محمد حامد صاحب حیثیت قائم مقامی کرتے رہے۔ اور دو دن اس خاکسار کے پاس چارج رہا پھر چوہدری رحیم علی صاحب ہاشمی نے باضابطہ ادارت سنبھال لی

چوہدری رحیم علی الہاشمی

چوہدری رحیم علی ہاشمی سے بھی لوگ شیش محل میں مل چکے ہوں گے۔ آپ ایک کہنہ مشق ہونے کے علاوہ اردو اور انگریزی جرنلزم کے بہت سے گرم و سرد کا تجربہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ اسی ہمدم میں پہلے بھی رہ چکے تھے۔ اس کے بعد متعدد اردو اور انگریزی اخبارات کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔ آدمی بہت عمدہ، نہایت شریف اور بہت نیک تھے۔ ہم لوگ ان کے ماتحت کم اور دوست زیادہ تھے۔ کھلانے پلانے والے آدمی تھے۔ اور اس میں دراصل آپ کا ذاتی قصور کبھی نہ تھا۔ آپکی بیگم صاحبہ اس سلسلہ میں بہت ہی دریا دل واقع ہوئی تھیں اور آپ کی دال گھر میں کبھی نہ گلتی تھی۔ سید جالب صاحب کے زمانہ میں تو دفتر محض دفتر تھا مگر اب دفتر کی حیثیت دفتر کے علاوہ کلب کی سی ہو گئی تھی۔ بیگم ہاشمی اکثر دعوتیں کرتی رہتی تھیں اکثر سے مراد تقریباً روز ہے خصوصاً ہمارے لیے کچھ راشن مقرر ہو گیا تھا۔ مثلاً دو پان صبح، دو پان شام۔ چار اور کبھی اگر کوئی خاص چیز پکی تو وہ ہاشمی صاحب بہت شوق سے آکر کہتے تھے کہ بیگم نے آپ کو کھانے پر یاد کیا ہے۔ ماش کی کھچڑی کے متعلق بیگم ہاشمی کو ہماری کمزوری کی اطلاع مل چکی تھی۔ لہذا وہ اکثر اس سلسلہ میں یاد فرمائی تھیں۔ پھر بیگم ہاشمی نے بٹوے بنا کر عنایت فرمانا شروع کیے جن کا

سلسلہ اب تک قائم ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہم نے ان کو بہت جلد اپنا لیا۔ اور اس سلسلہ میں ہمیشہ فائدے میں رہے۔ پانوں کی نہایت خوبصورت خس پوش ڈالیاں ہم کو ملنے لگیں۔ مٹھائی اور ناشتہ میں پہلے بحیثیت دیور کے جو خطرے قدم قدم پر رہا کرتے تھے۔ وہ دور ہو گئے مثلاً ایک مرتبہ نہایت صبر آزما قسم کے سنبوسے تیار کئے گئے۔ اور اب جو ہم کھاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان میں گھاس بھری ہوئی ہے۔ ان حالات کے ماتحت عافیت اسی میں نظر آئی کہ چپکے سے ان کے شوہر کا سالا ہونا منظور کر لیں۔ خود ہاشمی صاحب کی جو گت بنا کرتی تھی ہمارے لئے بیحد سبق آموز تھی۔ ہاشمی صاحب کی تمام قابلیت اس گھریلو ذہانت کے سامنے بغلیں جھانکنے لگتی تھی۔

ہمدم کا یہ دور بہت ہی ہنستے کھیلتے گزر رہا تھا۔ ہمارے سب ساتھی امتیاز احمد صاحب اشرفی مرحوم یعقوب خاں صاحب کلام وغیرہ آپس میں دوست اور ایک دوسرے کے صحیح معنوں میں ہمدرد تھے۔ خود ہاشمی صاحب نہایت نیک نفس آدمی تھے۔ اور اب چونکہ ہماری مشق کافی بڑھ چکی تھی۔ لہذا ہمارے ذمہ جتنے کام تھے وہ گویا خود بخود ہو جایا کرتے۔ اس زمانہ میں ملک کے ادبی رسائل میں بھی کافی لکھا۔

نسیم انہونوی

ہمدم کا یہی دور تھا کہ ایک روز جناب وصل بلگرامی کے بھیجے ہوئے ایک صاحب ہمارے پاس تشریف لائے۔ آنکھوں میں سرمہ، پیروں میں لغزش، اداؤں میں عروسیت اور ایک عجیب الطرفین۔ معلوم ہوا کہ آپ سید محمد نسیم صاحب انہونوی ہیں۔ اور رسالہ انکشاف کے ایڈیٹر ہیں۔ رسالہ کا تازہ پرچہ ساتھ لائے تھے۔ اور رسالے کے لئے

قلمی معاونت چاہتے تھے۔ ان حضرت میں اپنی طرف متوجہ کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ ہم نے قلمی معاونت کا وعدہ کر لیا۔ اور اپنے مضامین دینے کے علاوہ دوسروں کے مضامین دلوانے کا وعدہ بھی کر گزرے۔ اب کیا تھا نسیم صاحب سے روز ملاقات ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ہم کو ان کے دفتر جانا پڑا۔ جو انجمن عالیہ ایک آنہ فنڈ کے دفتر کے ایک گوشہ میں تھا۔ یہ رسالہ دراصل اسی انجمن کا پرچہ تھا مگر اب تک اس سے کام صرف یہ لیا جاتا رہا کہ چندہ دینے والوں کا شکریہ دستاویزی صورت میں پیش کر دیا جائے مگر نسیم صاحب نے اس کو ادبی شکل دینا چاہی اور وہ بے حد کامیاب ہوئے۔ انجمن کے سرسید نما سکریٹری مولوی سید خلیل احمد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ جو بجائے خود شخصیت کے اعتبار سے ایک ادارہ معلوم ہوتے تھے معلوم ہوا کہ آپ شعر بھی کہتے ہیں۔ اور "غمزدہ" تخلص البتہ ہم کو کچھ عجیب اور کچھ طویل سا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی اپنا تخلص "کانپور" رکھ لے۔ بلکہ گولہ گوکرن ناتھ ارادہ کیا کہ ان سے کہہ دیں کہ اتنا ہی بڑا تخلص رکھنا تھا تو ایک آنہ فنڈ تخلص کیوں نہ رکھا مگر یہ دیکھ کر چپ ہو گئے کہ ان کے یہاں کی تو ہر چیز نرالی ہے۔ مثلاً پاخانہ پر سائن بورڈ لگا رکھا تھا۔ "صحت خانہ" نہ جانے کتنے آدمی ہسپتال کے دھوکے میں وہاں چلے گئے ہوں۔ سید خلیل احمد صاحب نہایت عمدہ آدمی ثابت ہوئے، پکے مرد مومن اور مومن کی تو ایک خاص پہچان بتائی گئی ہے "شرمیلا ہونا"۔ یہ بات تو ان میں اس حد تک نظر آئی کہ سرسید نما داڑھی اور پھر ان دونوں کی آمیزش سے انسان چکرا کر رہ جاتے

نسیم صاحب ہمیشہ رسالوں کے معاملہ میں بڑے اولوالعزم قسم کے آدمی ہیں۔

خوب خوب نمبر نکالتے ہیں۔ چاہے دیوالہ ہی کیوں نہ نکل جائے۔ دل کے ارمان مگر ضرور پورے کریں گے۔ وہ اپنے زیر اہتمام نکلنے والے پرچوں کے خاص نمبر اس طرح نہیں نکالتے کہ یہ اخباروں یا رسالوں کے خاص نمبر ہیں۔ بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اولادوں کی شادیاں ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی انکشاف کے مختلف خاص نمبر نکلے۔ ایک نمبر تو ایسا تھا کہ اس کا سرورق لیڈ پیپر کا تھا۔ بے شمار تصویریں دیتے تھے بہتر سے بہتر مضامین جمع کرتے تھے۔ اور آخر کار جس وقت وہ خاص نمبر پریس سے لے کر آتے تھے چہرہ پر انبساط کی لہریں ہوتی تھیں۔ گویا دلہن بیاہ کر لائے ہیں۔ اب ان خاص نمبروں کی ترتیب میں ہم بھی برابر کے شریک تھے۔ اور نسیم صاحب اور ہمارے درمیان بغیر کسی تصفیہ کے گویا یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہم ان کی تجارتی صلاحیت کو سراہتے رہیں۔ اور وہ ہماری ادبی حیثیت کا اعتراف کرتے رہیں۔ ہم نے تو خیر ان کی ادبی حیثیت کا کبھی اعتراف کرنا چاہا تھا مگر وہ اس سلسلہ میں کچھ سنجیدہ نظر نہ آئے۔ افسانے لکھتے تھے۔ اور خوب لکھتے تھے۔ مگر اس کو کوئی ادبی کارنامہ نہ سمجھتے تھے البتہ اگر ان کی کسی تجارتی رمز کو سمجھ کر ہم نے کبھی داد دے دی، تو وہ اپنی آنکھوں میں ایک خاص خوشی کی چمک پیدا کر کے ہم کو اس طرح دیکھتے گویا نہایت سمجھدار آدمی سمجھ رہے ہیں۔ نسیم صاحب کی تجارتی حیثیت اور صلاحیت کو ہم زیادہ نمایاں نہ کر سکے۔ مگر ہماری ادبی صلاحیتوں کو وہ برابر اچھالتے رہے۔ اور آج تک اچھالتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہر ادبی کارنامہ پر دوستوں میں ان سے زیادہ خوش ہونے والا آج بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھ کر خوش نہیں ہوتے کہ یہ شوکت کا کارنامہ ہے بلکہ ان کو تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا یہ ان ہی سے متعلق کوئی چیز ہے۔ نسیم صاحب کا ذکر اس تذکرہ میں بار بار آئے گا۔ اور ان کی شخصیت

کے مختلف پہلو نمایاں ہوں گے۔ اس موقع پر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب ہم کو ایک ایسا ذریعہ مل گیا تھا۔ کہ ہم اپنی ادبی سرگرمیوں کو جس طرح چاہتے جاری رکھ سکتے تھے۔

مولانا سیماب سے جنگ

حضرت ساغر نظامی اور مولانا سیماب سے ہمارے تعلقات اب تک نہایت شگفتہ تھے۔ ۱۹۲۳ء سے یہ مراسم تھے۔ اور اب تک کوئی بات ایسی نہیں ہوئی تھی۔ جس سے ناگواری کا کوئی پہلو کسی طرف سے نکلتا ہو۔ مگر آج کل مولانا سیماب کی ادارت میں آگرہ سے ایک اخبار نکل رہا تھا۔ "تاج" اور اس اخبار میں ایک آدھ بحث ایسی ناگوار چھڑ گئی جس کا جواب ہم کو ہمدم میں دینا پڑا مولانا کے اخبار میں اس کا کچھ سخت جواب دیا گیا اور آخر باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ ہمدم کا "دو دو باتوں" والا کالم مولانا کے لیے وقف ہو گیا مولانا نے اپنے اخبار کے علاوہ اپنے ایک شاگرد خواجہ ستار الحسن جمیل کے اخبار فرشتہ میں بھی ہمدم کے خلاف کچھ لکھوانا شروع کیا۔ فرشتہ کی ایک تحریر کا جواب لکھتے ہوئے ہم نے ہمدم میں لکھ دیا۔ کہ "فرشتہ تو فرشتہ اس کے معلم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر نہیں کہ ہمدم روزانہ اخبار ہے۔ اور یہ گنڈے دار چھپنے والے ہفتہ وار اخبار اس کی روزانہ کی چوٹ کا اگر ہفتہ میں ایک بار جواب بھی دے سکیں تو بھی ہفتے کے باقی چھ دن سہلاتے گزر جایا کریں گے وغیرہ" اس میں فرشتہ کی رعایت سے معلم الملکوت والی چوٹ کی تاب مولانا نہ لا سکے اور تاج کے دوسرے ہی نمبر میں ان کا منظوم پیغام ہمدم کے باتونی کے نام چھپا جو ہمارے ذہن میں اس طرح محفوظ رہ

گیا ہے کہ ؎

اور نہ یاقوت ہے اور نہ استعداد باقی ہے ۔
فقط طاغوتیوں کی فکرِ مادر زاد باقی ہے
کوئی ہمدم کے یاقوتی سے جاکر صرف یہ کہہ دے
کہ شیطان مر گیا اس کی مگر اولاد باقی ہے

اس کے بعد بھی بہت دنوں تک اس لڑائی کا خاتمہ نہ ہوا۔ اور ادھر سے ہمدم ادھر سے تاج اور فرشتہ برابر ایک دوسرے کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھ رہے تھے۔ آخر ایک دن ہاشمی صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ اب اس جنگ کو ختم کر دینا چاہئے چنانچہ مولانا سیماب کی تازہ غزل پیمانہ کے تازہ پرچہ میں چھپی تھی۔ ع

میت نہ مری جاکر ویرانے میں رکھ دینا

ہم نے اس پر تنقید کی اور تمام اشعار پر تنقید کر چکنے کے بعد مقطع پر پہونچے ؎

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے
جذبات کی اک بجلی پروانے میں رکھ دینا

تو ہم نے لکھ دیا کہ اب جب کہ مولانا نے خود یہ کہہ دیا ہے کہ ع

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے

ہم کو مولانا کے متعلق اب کچھ نہیں کہنا ہے اور ہم آج اس بحث کو ختم کر رہے ہیں اس ناگوار بحث کے بعد جب مولانا سے پھر ملاقات ہوئی تو ان کا دل بالکل صاف تھا۔ اور ہم بھی ان سے شاکی نہ تھے ساغر صاحب سے بھی خوشگوار تعلقات قائم رہے اور مولانا سیماب کو آج بھی ہم اپنا محترم بزرگ سمجھتے ہیں اس اخباری لڑائی کو ہم دونوں

بھول چکے ہیں اور اگر ہم تھوڑی سی خیانت کر سکتے تو اس تذکرے میں بھی اس ذکر کے آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

سودیشی ریل

ابھی ہم ہمدم ہی میں تھے۔ اور اخبار کی ذمہ داریوں سے جو فرصت ملتی تھی اس کو دوسری ادبی دلچسپیوں میں صرف کرتے تھے۔ مختلف رسالوں کے لئے لکھا کرتے تھے۔ اور اب زیادہ تر فکاہی چیزیں لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگِ خیال لاہور کے سالنامہ سنہ ۱۹۳۰ء کے لئے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ سودیشی ریل کے نام لکھا۔ اس افسانہ کے چھپنے سے پہلے ہی نیرنگِ خیال کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کا ایک تفصیلی خط ہم کو ملا جس میں اس افسانے کی بے حد تعریف کی تھی۔ ہاشمی مرحوم سے ہم بالکل واقف نہ تھے نہ اس سے پہلے کبھی خط و کتابت ہوئی تھی۔ ہم نے اس تعریف کو یونہی رسمی سی چیز سمجھ کر سرسری سا شکریہ ادا کر دیا مگر سالنامہ نیرنگِ خیال کے شائع ہونے کے بعد اب جسے دیکھئے وہی ہم کو خط لکھ رہا ہے بہت سے نامی حضرات ملنے آئے۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے اس کو نقل کیا۔ ہندی، گجراتی، بنگالی اور مرہٹی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے یہاں تک کہ ڈاکٹر شفیع صاحب، کوئی بزرگ ہیں انھوں نے اس کا انگریزی ترجمہ ولایت کے گلوب نامی کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ یہ ترجمہ ہم نے خود نہیں دیکھا مگر اکثر لوگوں نے یہ روایت سنائی جس کے معتبر ہونے میں ہمیں آج بھی شک ہے مگر مختلف اردو، ہندی، بنگالی اور مرہٹی اخبارات جن میں یہ افسانہ نقل ہوا یا ترجمہ کر کے چھاپا گیا

ان کی تعداد چھپن ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانہ نے ہم کو مزاح نگاروں میں باضابطہ طریقہ پر شامل کر دیا۔ بلکہ اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "شوکت تھانوی کی مقبولیت کا سنگ بنیاد ان) کا افسانہ سودیشی ریل ہے"۔ اس افسانہ کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد مختلف باتیں مشہور ہوئیں مثلاً یہ کہ یہ سرکاری پروپیگنڈے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اور کسی سرکاری اشارے کے ماتحت لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ایک دوسری عجیب بات یہ بھی کہی گئی کہ یہ افسانہ کسی انگریزی افسانہ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے یہ افسانہ قطعاً طبعزاد ہے اور بغیر کسی تحریک کے لکھا گیا تھا۔ اس افسانہ کا مقصد دراصل یہ بھی نہ تھا کہ اس سے قومی جذبات اور قومی تخیل کو کوئی صدمہ پہونچے بلکہ یہ ایک خالص مزاحیہ چیز تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

سودیشی ریل کے بعد

سودیشی ریل کی مقبولیت کے بعد اب جس کو دیکھئے۔ وہ ہم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی سودیشی چیز لکھ دو اور تو اور خود ایڈیٹر نیرنگ خیال نے سودیشی ریل کے دوسرے حصے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ان تمام فرمائشوں کی تعمیل کر دی مثلاً نیرنگ خیال کے لئے ایک مضمون لکھا "سودیشی ریل کے بعد" نسیم انہونوی کی فرمائش پر دو تین مضامین لکھے۔ سودیشی ڈاکخانہ، سودیشی کونسل اور سودیشی عدالت وغیرہ مگر ان میں سے کسی میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ دراصل ان مضامین کا لکھنا ہی ہماری غلطی تھی۔ ہم کو سودیشی ریل کی اس مقبولیت سے خود متاثر نہ ہونا چاہئے تھا

اور سودیشی ریل ہی کو معراج سمجھ کر اسی کے ارد گرد رہ جانے کی کوشش نہ کرنا تھی۔ مگر یہ باتیں اس وقت نہ ہم خود سمجھ سکے نہ کوئی ہم کو سمجھا سکا۔ نتیجہ یہ کہ سودیشی مضامین لکھ کر ہم نے انتہائی کمزوری کا ثبوت دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سودیشی ریل کے بعد ہماری ادبی وقعت بہت بڑھ گئی تھی۔ کہ ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہئے تھا کہ اب پڑھنے والے ہم سے سودیشی ریل طلب نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس سے آگے کچھ اور، اور ہم کہ یہ سمجھے تھے کہ سودیشی ریل پر بیٹھے ہوئے اپنی منزل طے کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ خود ہی لکھ چکے تھے کہ اس بے چاری میں کوئلہ ہی نہ تھا۔ اور نہ اس کی کوئی سمت مقرر تھی کہ مشرق کی طرف جائے گی یا مغرب کی طرف بلکہ طے یہ تھا کہ جس طرف کے مسافر زیادہ ہو جائیں گے اسی طرف اس کو چھوڑ دیا جائے گا

اودھ اخبار

ابھی ہماری ادبی حیثیت پوری طرح پختہ بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ملازمت خطرہ میں پڑ گئی۔ یعنی یہ خبر مشہور ہوئی کہ ہمدم بند کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اس خبر کی تحقیقات شروع کرنے بھی نہ پائے تھے کہ تصدیق آ گئی۔ اور ہمدم واقعی بند کر دیا گیا۔ لیجئے ملازمت ختم اور اب ہمارا اللہ حافظ۔ اب تک ہم نے رسالوں کے لئے جو کچھ لکھا تھا اس کا کوئی معاوضہ کہیں سے نہ لیا تھا۔ نسیم صاحب کے لئے جس قدر کام کرتے تھے اس کے معاوضے کا تو ظاہر ہے کہ کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مختصر یہ کہ ہمدم کے بند ہونے کے بعد ہم کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں کچھ خلا سا محسوس ہونے لگا۔ مگر ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم کو اطلاع ملی کہ روزنامہ اودھ،، اخبار کے لئے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے لہٰذا ہم اودھ اخبار کے دفتر پہنچے، اور سید نور الحسن صاحب سے ملے جو اودھ

اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ہم نے معلوم نہیں کیوں ان سے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ ہم ملازمت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ حاضری کی وجہ یہ بنا دی کہ ہم کو اودھ اخبار میں کچھ اشتہار شائع کرانا ہیں اور چونکہ اب تک ہم آپ کی برادری کے ایک رکن تھے مگر وہ کبھی کچھ شرمائے سے جاتے تھے۔ آخر جب ہم اشتہارات کا نرخ وغیرہ معلوم کر چکے تو نورالحسن صاحب نے ایک مرتبہ جی کڑا کر کے ہم سے کہہ ہی دیا کہ "ہمدم سے آپ الگ ہو گئے ہیں تو اودھ اخبار میں آجائیے" ہم نے کوئی اشتیاق تو ظاہر نہیں کیا اور نہ یہ راز کھلنے دیا کہ ہم کو منہ مانگی مراد مل رہی ہے البتہ یہ کہہ دیا کہ میں یہاں کے حالات سے واقف نہیں ہوں معلوم نہیں آپ کیا تنخواہ دلوا سکیں گے۔ اور کیا شرائط ہوں گے۔ تمام باتیں مجھے معلوم ہوں تو میں غور کروں گا۔ سید نورالحسن صاحب نے تھوڑی دیر میں تمام حالات ہم پر واضح کر دیئے اور اسی دن ہم اس اخبار دنیا کے باوا آدم کے عملہ ادارت میں آ گئے بعد میں معلوم ہوا کہ خود سید نورالحسن صاحب مستقل ایڈیٹر نہ تھے۔ بلکہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب بغرض تبدیل آب و ہوا ذرا جبل تک گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا آپ ان کی قائم مقامی کر رہے تھے۔ مگر اخبار پر آپ کا نام قائم مقام کی حیثیت سے نہیں بلکہ مستقل ایڈیٹر کی حیثیت سے نکل رہا تھا بہر صورت ہم کو آم کھانے سے غرض تھی۔ پیڑ گننے سے کیا واسطہ۔ ہم نے کام شروع کر دیا۔ ہمدم والی "دو دو باتیں" کو اس اخبار میں شروع کیا۔ اور اپنے ذمہ اس مزاحیہ کالم کے علاوہ پورا ایڈیٹوریل کا صفحہ لے لیا کبھی سید نورالحسن لیڈر لکھتے تھے اور ہم شذرات اور دو دو باتیں کبھی وہ شذرات لکھتے تھے۔ اور ہم لیڈر اور دو دو باتیں۔ در اصل اس وقت اس اخبار کی حیثیت اخبار کی تھی ہی نہیں بلکہ ارکان اخبار کا مقصد صرف یہ تھا کہ چونکہ منشی

نولکشور صاحب آنجہانی نے اس اخبار کو جاری کیا تھا۔ لہذا یہ سرنامۂ عنوان ان کی تصویر کے نکلتا ہے جس طرح بھی نکلے۔ البتہ چونکہ بہت پرانا اخبار تھا لہذا اونچی کمپنیوں کے اشتہارات اس کے پاس بہت کافی تھے۔ مگر پھر بھی غالباً خسارہ میں چل رہا تھا ہم نے اس اخبار کے دفتر میں کام کر کے یہ تماشہ دیکھا کہ جس کا جس وقت جی چاہا چلا آیا۔ اور جب جی چاہا چلا گیا۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ خود ایڈیٹر صاحب اس قدر کم سخن تھے کہ کسی سے کچھ کہہ ہی نہ سکتے تھے۔ عملۂ ادارت والے یہ کرتے تھے کہ قلم سے زیادہ قینچی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس اخبار سے ایک خبر کاٹی اس اخبار سے ایک مضمون لیا کاتب نے زیادہ تقاضہ کیا تو کسی اخبار پر پنسل سے نشان بنا دیا۔ اور لیجیے اخبار تیار تھا۔ صرف ایڈیٹوریل والا صفحہ ایسا ہوتا تھا جسے لکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اور کبھی کبھی کچھ خبروں کے ترجمے بھی کر لئے جاتے تھے۔ سید نور الحسن صاحب سے کچھ ہی دنوں میں نہایت بے تکلفی ہو گئی۔ ایسی بے تکلفی کہ اب یہاں بھی کلب کی سی فضا پیدا ہونے لگی۔ ایک قسم کا لنچ ہم لوگوں نے ایجاد کیا جو روز گیارہ بجے کھایا جاتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ عملۂ ادارت کے چار ممبروں سے جو صاحب سب کے بعد آتے تھے وہ ایک روپیہ کی مٹھائی منگایا کرتے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مختلف مقامات سے آنے والے سب ایک ساتھ دفتر میں پہنچ نہیں نہیں سکتے تھے۔ کوئی نہ کوئی دیر میں پہنچتا ہی تھا۔ دیر کی مراد دفتر کی حاضری کے وقت سے نہیں بلکہ یوں بھی جو دیر میں آئے وہی اس دن کے لنچ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ دو ممبر ایک سمت سے ساتھ ساتھ پہنچے اور دروازے سے دفتر کے کمرے تک اس زور کی دونوں میں دوڑ ہوتی کہ کیا سول

سروس کپ کے گھوڑے دوڑیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دفتر کی حاضری کے مقررہ وقت سے پہلے ہی ہم لوگ پہونچنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جب بھی پہونچتے تھے۔ بلدیو پرشاد کہسرے نامی ایک بزرگ تھے —— ان کو ہمیشہ موجود پاتے تھے۔ اس سلسلہ میں کبھی ایک دن کا جرمانہ بھی ان پر نہیں ہوا۔ معلوم نہیں وہ رات کو بھی دفتر میں سوتے تھے۔ یا آگیا۔ باقی رہ گئے تین ممبران میں سب سے زیادہ جرمانے سید نورالحسن صاحب خود ادا کرتے تھے۔ حالانکہ فاصلہ سب سے زیادہ ہم کو طے کرنا پڑتا تھا۔ ہم وکٹوریہ اسٹریٹ سے حضرت گنج پہنچتے تھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد معلوم یہ ہوا کہ مستقل ایڈیٹر صاحب جیل سے واپس آرہے ہیں۔ سید نورالحسن صاحب نے استعفیٰ دیدیا۔ اور ہم کو قائم مقامی کرنا پڑی۔ اب ہم اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اسی زمانہ میں منشی کشن نرائن صاحب کا انتقال ہوگیا۔ جو نول کشور اسٹیٹ کے مالک تھے۔ اور تمام اسٹیٹ مع اخبار کے کورٹ آف وارڈس میں چلا گیا۔ اس لئے کہ نئے مالک کے بالغ ہونے میں کچھ عرصہ تھا۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیل سے آنے کے باوجود یہ ایڈیٹر صاحب اخبار کی ادارت پر واپس نہ آسکے۔ اور ہم خوش تھے کہ ہمارا نام اس جگہ نکل رہا ہے۔ جہاں اب سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار ایسے بزرگوں کا نام نکل چکا ہے مگر ہم نے یہ ایک احتیاط لی تھی کہ ہم نہ تو کبھی پنڈت کشن نرائن بھارگو آنجہانی سے ملے تھے اور نہ نول کشور اسٹیٹ کے کسی اور ذمہ دار سے ملنے کی کبھی کوشش کی تھی۔ اور نہ اب کورٹ آف وارڈس کے افسران سے ملنے کی کوشش کرتے تھے۔ جو ہماری قسمت کے گویا ذمہ دار بن چکے تھے۔ لہذا وہاں اندر ہی

اندر ایک کھچڑی پکی اور ایک اور صاحب کو اخبار کی ادارت پر بلا کر ہم کو بدستور اسسٹنٹ ایڈیٹری پر واپس کر دیا گیا۔ ہم اس پر بھی بددل نہیں ہوئے اس لیے کہ اتنے دنوں تک اخبار کو سنبھالنے کا ہم کو کوئی مزید معاوضہ نہیں ملا تھا۔ جو تنخواہ ملتی تھی وہی ملتی رہی۔ ایک صاحب نے یہ بات بالکل سچ کہی تھی تول کنٹور اسسٹنٹ کی ملازمت تو گویا ایک قسم کی پنشن ہے۔ جو ہمیشہ ملتی رہتی ہے جس میں نہ کام کی کوئی خاص پوچھ گچھ ہوتی ہے۔ نہ برطرفی کا کبھی سوال پیدا ہوتا ہے۔ مگر سوال تو یہ تھا کہ کیا زندگی بھر اسی تنخواہ پر ہمیشہ رہنے کیلئے مجبور رہتے۔

موجِ تبسم

نسیم صاحب نے ہمارے مضامین کا پہلا مجموعہ "موجِ تبسم" کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ گویا ہماری پہلی کتاب تھی۔ اور مصنف بننے کے شوق میں ہم بھوک پیاس بھولے ہوئے تھے۔ کتابت کے دوران میں کاتب کا گویا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ طباعت کے وقت پریس میں نظر آتے تھے۔ کاپیاں رات گئے پروف پڑھتے تھے۔ اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح آج ہی کتاب ہاتھ میں آ جائے۔ خدا خدا کرکے کتاب تیار ہوئی۔ اور اب نسیم صاحب نے کہا کہ چلو اس کتاب کو لے کر نینی تال دہلی اور لاہور وغیرہ کا سفر کر آئیں۔ سب سے پہلے ہم لوگ بھوالی ضلع نینی تال پہنچے۔ جہاں برادر محترم ڈاکٹر محمد زبیر صاحب اس وقت ملازم نہ تھے۔ بلکہ دق کے مریض کی حیثیت سے مقیم تھے۔ اور اب دق کے مریضوں کے اسی سینی ٹوریم میں معالج ہیں۔ بھوالی میں موجِ تبسم کی کافی اشاعت

ہوئی۔ جتنے خریدار اس چھوٹی سی جگہ میں ہم کو ملے۔ ہم اس کو بہت سستا سمجھتے تھے۔ بھوالی سے پیدل ہی نینی تال کا سفر کیا۔ اور اس سفر میں نسیم صاحب اس قدر خستہ و خراب ہوئے کہ ان کو واپسی میں اپنے متعلق یہ شبہ ہو گیا تھا کہ شاید قد کچھ چھوٹا ہو گیا ہے۔ یعنی پیر کچھ گھس گئے ہیں۔ بھوالی اور نینی تال کے اس سفر کے بعد ہم دونوں دہلی پہونچے۔ اور تاج محل نامی ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی دن احباب سے ملے۔ اور آخر اکبر حیدری مرحوم نے ہم دونوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ اسی دن نیرنگ خیال کے ایڈیٹر حکیم یوسف حسن صاحب اور اسسٹنٹ ایڈیٹر حنیف ہاشمی مرحوم ان کے یہاں مدعو تھے۔ کھانے پر برادرم عشرت رحمانی صاحب بھی تھے۔ باتوں ہی باتوں میں نسیم انہونوی میں اور حکیم یوسف حسن صاحب میں کچھ یو۔پی اور پنجاب کی بحث چھڑ گئی جس نے نہایت ناگوار طول کھینچ لیا۔ اور آخر ہم کو اور اکبر حیدری مرحوم کو اس بحث میں پڑ کر اسے ختم کرانا پڑا۔ مگر نسیم اس قدر ناراض ہوئے کہ پنجاب جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ ہم لوگ ابھی ہوٹل میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ "آپا نے یہ پرچہ دیا ہے اور جواب مانگا ہے" یہ پرچہ وہاں کے ایک زنانہ رسالہ کی ایڈیٹرس صاحبہ کی طرف سے تھا جنہوں نے ہم کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ پہونچے اور گو وہ خود پردہ میں رہیں مگر ان سے کافی تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ آخر جب ہم واپس آنے لگے تو ہم سے رسالہ کے لئے ایک مضمون کا وعدہ لیا گیا۔ جسے ہم نے ہوٹل پہنچ کر رات ہی میں ختم کر دیا۔ اس لئے کہ ایک خاتون کا مطالبہ تھا اور صبح وہ مضمون ان کو بھجوا دیا۔ دہلی کے اس سفر میں "موج تبسم" اور حسب ہم کے لئے کافی کام ہم لوگوں

نے کیا۔ اور خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

اخبار سرپنچ کا اجراء

نسیم صاحب رسالہ انکشاف سے علیحدہ ہو کر ایک زنانہ رسالہ حریم کے نام سے نکال رہے تھے۔ جو اب تک نکل رہا ہے۔ اس رسالہ کے عملہ ادارت میں شوکت تھانوی کا نام بھی تھا۔ اور اس رسالہ میں ہم برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ نسیم صاحب سے جو تعلقات قائم ہو چکے تھے، وہ کسی طرح برادرانہ تعلقات سے کم نہ تھے۔ بلکہ بھائی تو خیر یوسف کے بھی تھے۔ مگر نسیم ایسے دوست کم ہوتے ہیں۔ اب گویا ہمارے دوستوں میں یعنی سلونوی اور نسیم انہونوی ہی دو ایسے تھے جن پر ہر طرح پورا بھروسہ ہو سکتا تھا۔ ہم لوگ زیادہ سے زیادہ ساتھ رہتے تھے۔ اور ہر ہنگامے میں تینوں، باپ بیٹا روح القدس کی طرح ساتھ ساتھ شرکت کیا کرتے

ایک دن ہم تینوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک ہفتہ وار خالص مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ نسیم صاحب نے فوراً اپنے چہرہ پر تجارتی تحیر کے آثار پیدا کئے۔ یعنی صاحب نے نتھنے پھلا کر اپنے رسالہ نظر کے تجربہ کو اجاگر کرنا چاہا اور اتنی دیر میں ہم نے اخبار کا نام سرپنچ تجویز کر دیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں امین آباد پارک کے سبزہ زار پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری اسکیم تیار ہو گئی لیجیے دو ہی تین دن کے اندر ڈیکلریشن داخل کر دیا گیا اور طے یہ پایا کہ ہم کو زرد کوٹھی سے اٹھ کر امین آباد ہی کے کسی حصہ میں آجانا چاہئے اس لئے اتنی دور رہنا، ادھر اخبار کی ملازمت کرنا۔ اور پھر سرپنچ کی ادارت کرنا۔ یہ سب آسان نہ رہے گا! رائے معقول تھی لہٰذا ہم نے والدہ صاحبہ سے اجازت

لی۔ بیوی کی انگلی پکڑی۔ ایک بچہ یعنی میاں سعید عمر کو بھی جو ابھی چند ماہ کے تھے، ساتھ لیا اور لاٹوش روڈ کے ایک مکان میں آگئے۔ جو اندر سے ہمارا مکان تھا۔ اور باہر سے اخبار سرپنچ کا دفتر۔ اب بیگم صاحبہ کے سر بھی گھرداری آپڑی تھی۔ ہم نے آج تک سب کچھ کیا تھا۔ لیکن نون تیل لکڑی کی فکر بھی نہ کی تھی۔ اور اب تو پریشان تھے کہ کیا کریں گے۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری بیوی کا۔ اس نے ہم کو ان فکروں میں آج تک مبتلا نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ہم کو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ آٹے کا کیا بھاؤ ہے۔ لکڑی کس حساب سے آتی ہے۔ گوشت کتنے سیر ہے۔ بیگم صاحبہ دھمکاتی ضرور ہیں کہ یہ سب باتیں آپ کو آنا چاہئیں۔ مگر یہ دھمکی عملی صورت کبھی اختیار نہیں کرتی۔ اس ذرا سے مکان بدلنے ہی میں بدحواسی کا عالم یہ تھا کہ گویا شہر کے ایک محلہ سے دوسرے محلہ نہیں جا رہے ہیں بلکہ ولایت کا سفر درپیش ہے۔ حالانکہ یہ کام سب دوسرے لوگوں نے کیا تھا اور ہم صرف یہ کہہ کر چلے آئے تھے بیگم سے شام کو نئے گھر میں ملاقات ہوگی۔ مگر اللہ اکبر وہ اہتمام تھا۔ اور وہ ذمہ داری محسوس ہو رہی تھی کہ گویا نہ جانے کتنی بڑی مصیبت پڑ گئی ہے۔ گھر کا تمام انتظام بیگم نے درست کر دیا۔ اور ادھر ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہم نے ارباب ثلاثہ کا اخبار سرپنچ نہایت شاندار طریقہ پر بہت ہی خوبصورت سرورق کے ساتھ نکالا۔ پرچہ دو قسم کا چھاپا گیا۔ ایک عام ایڈیشن "غریبانہ" اور دوسرا ایڈیشن "امیرانہ"۔ یہ ان دونوں ایڈیشنوں کے نام تھے۔ غریبانہ تو زندہ نہ رہ سکا مگر امیرانہ سرپنچ کی یادگار تھی جو آج تک قائم ہے۔ سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا نام تھا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر امین سلونوی، اور مینیجنگ پروپرائٹر نسیم انہونوی پہلا

یہ پرچہ بازار میں آیا تھا کہ لوگوں کو دوسرے اور پھر تیسرے اور آخر ہر نمبر کا مسلسل انتظار رہنے لگا۔ نئے نئے کالم اس میں جاری کئے۔ تمام اطراف ملک کے مزاح نگاروں سے بہتر سے بہتر مضامین لکھوا لئے۔ نئے نئے مزاح نگار پیدا کئے۔ اور کچھ ہی دنوں میں سرپنچ نے اپنا ایک خاص حلقہ بنا لیا۔ اور خریداروں کی تعداد میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس اخبار کی ایک خاص وقعت اخباری برادری میں بھی قائم ہوگئی۔ اس کے مضامین معاصرین نے نقل کرنا شروع کردیئے اور اس کے تبصروں سے بڑے بڑے سورما چوکنے رہنے لگے۔ کہ معلوم نہیں کب کس کی کس رنگ میں خبر لے لی جائے۔

خورشید عمر

سعید عمر بڑا بچہ پونے دو سال کا تھا کہ دوسرے صاحب خورشید عمر تشریف لے آئے۔ سعید کا رنگ سانولا تھا۔ مگر یہ بچہ نہایت سرخ و سپید پیدا ہوا۔ بلکہ جب تیسرے دن خالہ ارشاد صاحبہ اس کو لے کر مجھے دکھانے لائیں۔ تو میں سمجھا یہ مجھ سے مذاق ہو رہا ہے۔ کسی اور کا بچہ لے کر آگئی ہیں۔ بھلا میرے یہاں ایسا حسین بچہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر بعد میں اس بچے نے دور ہی ہاتھ پیر نکالے۔ خوب موٹا تازہ اور نہایت شگفتہ ہو گیا۔ مگر میں سعید کو زیادہ چاہتا تھا۔ اور میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ سعید کی دل شکنی ہوگی۔ اگر اس کے ساتھ کسی کو چاہا جائے گا بلکہ جب بڑا ہو جائے گا تو ممکن ہے کہ اس کو یہ خیال بھی آنے لگے۔ کہ خورشید کو اس لئے چاہا جاتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے میں اپنے سامنے سعید کو بد دل کرنا نہ چاہتا تھا۔ مگر یہ

حضرت خورشید خود ہی مجھ سے بہت زیادہ لپٹنے لگے۔ اور آخر رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ کسی وقت وہ مجھ سے علیحدہ ہی نہ ہونا چاہتے تھے۔ اب بھی سعید اور خورشید میں رنگ کا وہی فرق موجود ہے۔ مگر سعید نہایت متین اور سنجیدہ ہیں اور خورشید نہایت طرار اور بذلہ سنج۔ سعید کو پڑھنے کا زیادہ شوق ہے۔ اور خورشید عام دلچسپیوں میں اپنے کو ہمیشہ مصروف رکھتے ہیں۔

ایک مشاعرے کی صدارت

جھانسی میں ایک مشاعرہ بہت بڑے پیمانہ پر منعقد کیا گیا۔ اور اس کی صدارت کے لئے ہم کو وہاں سے طلب کیا گیا۔ اب ہمیں یہ فکر کہ یا اللہ یہ صدارت کیونکر ہو سکے گی۔ ہم سے۔ غزل پڑھ دینا دوسری بات ہے حلقۂ احباب میں جھک لینا دوسری چیز ہے۔ مگر مشاعرہ کا خطبۂ صدارت کیسے پڑھیں گے معلوم نہیں کتنا مجمع ہو۔ کیسے کیسے شاعر ہوں۔ انتظام تو بڑے پیمانہ پر نظر آتے ہیں۔ شاندار بات تو یہ ہے کہ زبانی کچھ اس طرح بول دیں کہ لوگوں کو یہ خیال گزرے کہ برجستہ کچھ دیا ہے مگر یہاں اس کی عادت ہی نہ تھی۔ آخر طے کیا۔ کہ خطبۂ صدارت تو لکھا ہوا ہوتا ہی ہے لکھ کر کیوں نہ لے جائیں۔ چنانچہ ایک خطبہ لکھا اور پڑھنے کی کئی ریہرسل کئے۔ اور آخر مقررہ تاریخ پر پہنچنے کے لئے جھانسی روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ جھانسی کے اسٹیشن پر لوگ لینے آئیں گے۔ لہٰذا ہم پہلے ہی سے بنے سنورے کچھ صدر منتخب بنے ہوئے پلیٹ فارم پر اترے۔ مشاعرے کے کچھ رضا کار ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ ہر ڈبہ میں جھانک رہے تھے۔ مگر ہم سے کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ آخر بڑی دیر کے بعد ایک

رضاکار صاحب نے ہمارے پاس آکر دریافت کیا۔

"کیا آپ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں"

عرض کیا "جی ہاں"

فرمایا "اس ٹرین سے شوکت تھانوی صاحب تشریف لانے والے تھے ان کو تو آپ نے نہیں دیکھا؟"

عرض کیا "میں ان ہی کا لڑکا ہوں۔ والد صاحب تشریف لانے کے لئے بالکل تیار تھے۔ کہ کل صبح ہی فالج کا نہایت سخت حملہ ہوا اور آخر مجھ کو حکم دیا کہ تم میرا خطبۂ صدارت لے کر چلے جاؤ۔"

سب رضاکار اس وقت ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اور اس حادثہ کا سب ہی کو افسوس تھا۔ مجبوراً شوکت تھانوی صاحب کے بجائے ان کے صاحبزادے کو لے کر سب چلے۔ کہ اتنے میں برادرم حسن آمد صاحب شاہجہانپوری "شوکت بھائی۔ شوکت بھائی" چیختے دوڑتے ہوئے آئے، اور ہم سے بغلگیر ہو گئے۔ ہم نے ان کو یہ لطیفہ سنا کر کہا کہ یہ بیچارے اس ٹرین پر شوکت تھانوی کی مناسبت سے مولانا شوکت علی کی قسم کا ایک بھاری بھرکم کوئی شوکت تھانوی تلاش کر رہے تھے۔ اگر میں ان سے کہتا کہ میں ہی شوکت تھانوی ہوں تو ان کو ہرگز یقین نہ آتا یا اگر یقین آتا تو یہ بیچارے مایوس ہوتے۔ شوکت تھانوی پر فالج کے حملہ سے بھی زیادہ مایوس۔ آپ کو چاہئے تھا۔ کہ اتنا بڑا مشاعرہ کیا تھا تو اتنا ہی بڑا صدر بھی چنا ہوتا۔ ایک سوکھا سہما فاقہ زدہ صدر چن کر آپ نے یہ لطیفہ پیدا کیا ہے۔ اس قصہ کا مشاعرے کے آخر تک چرچا رہا مشاعرے میں کچھ نہ پوچھئے کہ

خطبۂ صدارت کس طرح پڑھا ہے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ خود اپنی پھانسی کا حکم خود اپنے کو سنا رہے ہیں۔ ایک تو جھانسی کی گرمی اس پر نیا نویلا صدر، تمام جسم سے پسینہ کا ایک دریا رواں تھا۔ شروع شروع میں کاغذ کے حروف بھی نظر نہ آتے تھے ہم نے دو دفعہ پیرا ترک بھی اور دونوں ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ پہلے تو خیر لطیفہ کے طور پر فالج گرا تھا۔ مگر اس وقت ہم خود فالج بن کر گرنے ہی والے ہیں۔ کسی کے اوپر، مگر حاضرین نے ایک آدھ فقرے پر تالیاں بجائیں۔ اور ایک آدھ جگہ لوگ ہنسے تو یہ ارتعاش ختم ہوا اور آخر خطبۂ صدارت جو ہم نے اپنی عقلمندی سے نہ جانے کیوں ذرا طویل لکھ لیا تھا۔ ختم ہوگیا۔ جان بچی لاکھوں پائے ــــ یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم کو یہ معلوم ہوتا کہ صدارت کا اعزاز ہمارے لئے اس قدر گراں ثابت ہوگا۔ اور ہماری جان پر اس طرح بن جائے گی۔ تو دور ہی سے سات سلام کرتے۔ اور بانیانِ مشاعرہ سے کہدیتے کہ ہماری مصروفیات ہم کو اجازت نہیں دیتیں کہ ہم مقررہ تاریخ پر آپ کے مشاعرے کی صدارت کریں۔ یہ طریقہ بھی حکماء نے بڑا آدمی بننے کے لئے مجرّب بتایا ہے۔

رفیع احمد خاں

ان حضرت کو اکثر مشاعروں میں صفِ سامعین کی زینت بنے ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ [illegible] صاحب کے رسالہ نگار کے ایڈیٹوریل بورڈ میں آپ کا نام نامی اسم گرامی تھا۔ مگر اب تک آپ سے براہِ راست ملاقات نہ ہوسکی تھی اتفاق سے اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے سے جو بلا وجہ طویل ہوتا چلا جا رہا تھا

دو تین آدمی چپکے سے فرار ہوئے۔ ان میں ایک یہ خاکسار اور دوسرے رفیع احمد خاں صاحب تھے۔ ہم چپکے سے بھاگے تھے۔ اس کی توجیہ یہ تھی کہ ہم غزل پڑھ چکے تھے اور اخلاقاً اب آخر مشاعرہ تک ہم کو ٹھہر کر دوسروں کا کلام سننا چاہیے تھا۔ مگر ہم حیران تھے کہ یہ حضرت تو محض سامع تھے۔ یہ اس قدر کیوں چھپ کر جا رہے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ کو ایک شاعر صاحب بیحد اصرار کر کے لائے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کا مقصد یہ ہوگا کہ خان صاحب ان کی مشاعرے کی سرخروئی دیکھیں اور غزل سن کر داد دیں۔ مگر چونکہ ان کے پڑھنے میں کافی دیر تھی لہذا آپ ان سے آنکھ بچا کر فرار ہوئے ہیں۔ ہم دونوں کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح کوئی سواری مل جائے تو گھر تک پہونچ جائیں۔ اس مشاعرے کی صدارت متین الدین صاحب ایڈوکیٹ مرحوم کر رہے تھے۔ یکایک خان صاحب نے دیکھا، ان کا کار غالباً ان کو واپس لے جانے کے لئے آرہا تھا۔ بیچ سڑک پر دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہوگئے۔ ڈرائیور نے کار روک لیا۔ تو آپ نے پوچھا متین صاحب کی گاڑی ہے نا۔ اس نے کہا، جی ہاں۔ کہنے لگے "فوراً چلو امین آباد" اور ہم سے کہا، متین صاحب نے اندازہ تو بالکل ٹھیک لگایا تھا کہ راستہ میں گاڑی مل جائے گی۔" ڈرائیور نے اب کوئی بھی سوال نہ کیا۔ اور ہم دونوں کو کار میں بٹھا کر امین آباد لے آیا۔ خانصاحب معلوم نہیں کیا کہنے والے تھے۔ کہ ہم نے ڈرائیور سے کہا "اچھا اب جاؤ۔ اور کہہ دینا کہ دکان بند تھی۔ ڈرائیور بے چارہ چپکا چلا گیا تو خانصاحب نے ہنسی سے بے قرار ہو کر کہا "یہ ٹکڑا قسم خدا کی حاصل مشاعرہ ہے۔ کہ کہہ دینا دکان بند تھی۔" اس وقت چار بجے رات کو دکان کے

نکی تک وہ لاجواب رہی ہے۔ کہ تمکین صاحب بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے"
اس ملاقات کے بعد سے اور اس مشترکہ شرارت کے بعد ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ ہم دونوں کی زندگی علیحدہ علیحدہ نہایت قطعاً مہمل ہے اور اس وقت تک کوئی مفہوم ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک یہ دونوں مصرعے ساتھ پیش نہ ہوں چنانچہ خانصاحب نے اپنی کسی دلچسپی میں ہم کو اور ہم نے کسی سرگرمی میں خانصاحب کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ہر چند کہ خانصاحب کے مشاغل کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہم کو کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ مگر خانصاحب چاہتے تھے کہ ان کے وہ مشاغل بھی ترک نہ ہوں اور ہم بھی ان کے ساتھ رہیں۔ ہم نے اب تک اتنا ذہین اتنا برجستہ اور ایسا قابل قدر آدمی نہیں دیکھا تھا۔ قابلیت سے خانصاحب نے کبھی کوئی فائدہ خود تو نہیں اٹھایا۔ مگر ان کی قابلیت سے دوسرے ہمیشہ فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ آپ کے عجیب و غریب مشاغل تھے۔ مثلاً آندھی آئے یا پانی برسے۔ طوفان آئے یا قیامت برپا ہو جائے۔ آپ کے لئے شام کے وقت چوک جانا۔ دفتر کی حاضری سے کسی طرح کم ضروری نہ تھا۔ اور تقاضا یہ کہ تم بھی چلو۔ ہم اس کوچہ سے بالکل واقف نہ تھے۔ ایک وحشت سی ہمیشہ ہوتی تھی۔ مگر رفیع احمد خاں کی جادوگری میں بھی بنگال کی جادوگرنیوں سے کچھ کم کمال نہ تھا۔ وہ کسی زمانہ میں آدمی کو بیل بنا کر کھونٹے سے باندھ دیا کرتی تھیں۔ خانصاحب نے اپنے جادو کے زور سے ہم کو بھی اپنی قسم کا جانور بنا کر رکھ دیا تھا۔ اور ہم ان کے ساتھ بلا ناغہ چوک جانے لگے تھے۔ بغیر کسی دلچسپی کے، ان کو چوک کی مخلوق سے دلچسپی تھی اور ہم کو ان سے، ان کی ذہانت سے اور ان کی باغ و بہار انداز طبیعت سے

ان کے چوک کے دوستوں کا حلقہ ہی دوسرا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ خان صاحب کے ان سے بڑھ کر دوست اور کوئی نہیں ہیں۔ جس کو دیکھئے خان صاحب سے واقف جس کو دیکھیے وہ خانصاحب کو گھیرے ہوئے اور سب کو حیرت کہ خانصاحب کے ساتھ یہ نیا جانور کون سا ہے۔

ایک شدید امتحان

رفیع احمد خاں صاحب کو ایک ضد یہ تھی کہ ان کے دوستوں میں یہ دعویٰ کوئی کیوں کرے کہ میں بڑا پارسا ہوں وہ اس کبڑی بڑھیا کے مانند تھے۔ جو دعا کرتی تھی کہ خدا کرے ساری دنیا کبڑی ہو جائے۔ چنانچہ رفیع احمد خاں صاحب نے ہم کو بھی ایک ایسے بالاخانہ پر پہنچا دیا۔ جہاں ایک نہایت ہی معقول قسم کی صاحبزادی اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھیں۔ خان صاحب کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور معلوم یہ ہوا کہ آپ کے لئے یہ جگہ نئی نہیں ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ خان صاحب کسی جگہ کو اپنے لئے نئی نہ رہنے دیتے تھے۔ پوری تو خیر صرف ایک ہی جگہ کرتے تھے مگر ہیرا پھیری کے لئے تمام چوک پڑا ہوا تھا۔ بہر صورت اس جگہ ہم خانصاحب کے ساتھ پہلی مرتبہ آئے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد خاں صاحب نے کیرم بورڈ اپنی طرف گھسیٹ کر ایک بازی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ بڑی بہن اور خان صاحب پارٹنر ہو گئے۔ ہم اور چھوٹی بہن پارٹنر بنے اتفاق سے سب سے اچھا کیرم ہم کھیلتے تھے۔ اس لئے کہ مشق بڑھی ہوئی تھی اور آج کل گھر پر روزانہ کیرم ہوا کرتا تھا۔ اب چھوٹی بہن نے کھیل کے جوش میں شاباش

ہے ۔ پارٹنر کیا کہنا ہے پارٹنر وغیرہ کہہ کہہ کر براہ راست ہم کو مخاطب کرنا شروع کر دیا ۔ اور آخر میں جب ہم جیت گئے تو کچھ یہی کہا ۔ اب جی کا جی چاہا ہے ہم سے کوئی بڑی سے بڑی شرط لگا کر کھیل لے ۔ خان صاحب نے دوسرے دن کے لئے باقاعدہ میچ طے کر لیا ۔ اور کچھ مٹھائی وغیرہ کی شرط بھی ہو گئی ۔ اسی طرح اب روز میچ ہونے لگے ۔ اور روز ہم کو خان صاحب کے ساتھ وہاں جانا پڑا ۔ ہمارے اور خان صاحب کے علاوہ مرزا صاحب بھی جاتے تھے ۔ جن کا پورا نام اس موقع پر اس لئے لکھنا مناسب نہیں ہے کہ ممکن ہے مرزا صاحب اس کو اپنے لئے مناسب نہ سمجھیں ۔ ہمارا کیا ہے ہم تو اوکھلی میں سر ڈال ہی چکے ہیں ۔ اس روز کے پھیروں کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ ہماری پارٹنر نے رنگ لانا شروع کر دیئے ۔ عجیب عجیب لگاوٹ کی باتیں عجیب عجیب مطالبات مثلاً یہ کہ ہم مرزا صاحب اور خان صاحب کے ساتھ آنے کی بجائے تنہا بھی آیا کریں ہم اگر کسی روز نہ گئے تو دوسرے دن خان صاحب نے ان کی شکایت ہم تک پہونچا دی اور اب ہم پر زور دیا جا رہا ہے ۔ کہ چلو میں ان سے وعدہ کر کے آیا ہوں ۔ کہ کل ضرور تمہارے پارٹنر کو لے کر آؤں گا ۔ ہم اس خطرہ سے آگاہ ہو چلے تھے ۔ اور اب ہم رسیاں تڑا رہے تھے ۔ ادھر خان صاحب ہماری اس کیفیت سے مایوس ہوتے جاتے تھے ۔ مرزا صاحب ادھر کے پیغامات لاتے تھے ۔ اور عجیب عجیب باتیں روز آکر سنایا کرتے تھے ۔ کہ بھئی تم کیوں اس کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہو ۔ کل بھی جب ہم لوگوں کے ساتھ تم کو اس نے نہ دیکھا تو بیچاری کے آنسو نکل پڑے ۔ حد یہ ہے کہ اس کی بڑی بہن تک کہہ چکی ہے کہ

یہ ایسی ہی بے قرار ہے تو اپنی ذمہ دار خود ہے۔ اور وہ اگر کسی تجارتی خیال کے ماتحت یا کسی اقتصادی مشکل کی وجہ سے نہیں آتے تو ان سے کہہ دیجیے کہ شوق سے آئیں روپیہ پیسے کا کوئی سوال نہ ہوگا"۔ مگر ہم نے نہ تو خان صاحب کا اس سلسلہ میں کہنا سنا اور نہ مرزا صاحب کی کوئی بات مانی۔ خدا کو بچانا تھا۔ اس نے ہم کو بچا لیا اور ہم اس امتحان میں بفضلہ کامیاب رہے۔

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی

اس امتحان میں تو کامیاب ہو گئے۔ مگر ایک دوسرا امتحان سر پر آگیا یعنی وہی صاحبہ جو دہلی میں ہم کو دعوت دے چکی تھیں لکھنؤ تشریف لاکر ایک سرائے میں ٹھہر گئیں۔ اب ہم نے یہ سوچا کہ ایک شریف گھرانے کی خاتون کا اس طرح ہمارے شہر میں آکر ایک سرائے میں ٹھہرنا کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا چنانچہ ہم نے ان کے بھائی صاحب سے کہا۔ آپ اپنی ہمشیرہ کو یہاں لے آئیے میں اپنی بیوی سے ان کو ملا دوں گا۔ اور وہ یہاں آرام سے رہ سکیں گی تھوڑی ہی دیر میں وہ ہمارے یہاں آگئیں۔ چونکہ پردہ کرتی تھیں۔ لہذا ہم نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ آپ ان کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش کیجیے۔ ان کے بھائی صاحب کی مدارات میں کروں گا۔ اب وہ ہمارے یہاں مہمان ہو گئیں۔ ایک ہفتہ، دو ہفتے تین ہفتے۔ ایک مہینہ۔ دو مہینے۔ تین مہینے۔ اور ایک دن یہ کہہ کر کہ جب میں بھائی صاحب کہتی ہوں تو پردہ کیسا۔ سامنے آگئیں نہایت حسین و جمیل نہایت نمک دار اور نہایت خوش مذاق ہم پر یا بیوی پر ان کا اس قدر رحم کر رہتا

ہرگز بار نہ تھا۔ مگر بیوی غریب گرفتار ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ کہیں آ سکے نہ جا سکے مہمان کو گھر پر کیسے چھوڑ دیا جائے۔ آخر ایک ضرورت سے ان کو والدہ صاحبہ کے پاس زرد کوٹھی جانا پڑا۔ مگر ہم بھی ان کے ساتھ گئے۔ اور ان محترمہ کے سپرد گھر کی چابیاں کر دی گئیں۔ کیجیے آپ جانیں آپ کا کام جانے۔ رات کو تو خیر زرد کوٹھی میں بیوی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ مگر دن کو سرپنچ کے دفتر کی وجہ سے اس گھر میں بھی آنا پڑتا تھا۔ اور یہی آنا جانا آخر ایک دن ہم کو لے ڈوبا ادھر سے پسندیدہ نظریں۔ ادھر سے ان نظروں کی پذیرائی۔ شیطان نے ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر اس قدر کھینچا کہ دونوں ایک ہو گئے۔

احساسِ شکست

ہم ڈوب چکے تھے۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ مگر اس گناہ کے بعد ہی آنکھیں کھل گئیں سب سے پہلے ذہن اس معصوم بیوی کا خیال آیا جس کی ہم نے خیانت کی تھی اور جو ہم پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتی تھی جس نے آج تک کبھی ہم پر شک نہ کیا تھا۔ اور جس کے اعتماد کو آج ہم نے اس بری طرح پامال کیا تھا۔ گناہ کی لذت کے بعد احساسِ گناہ کی بے چینی ہم کو مارے ڈالتی تھی۔ اور ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم کس طرح اس بوجھ سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ آخر ہم نے ایک قطعی فیصلہ کیا اس فیصلہ پر غور کیا۔ اور نتائج سے قطعاً بے فکر ہو کر ہم نے ایک اقراری مجرم کی طرح اپنے کو بیوی کے سامنے پیش کر دیا۔ بیوی کے پاس پہنچ کر ہم اس قدر روئے کہ وہ بے چاری بھی پریشان ہو گئی اور رو رو کر ہم نے تمام قصہ من و عن بیان کر دیا۔ ظاہر ہے

کہ اس غریب کے دل کو دھچکا لگا ہوگا۔ مگر اس نے ہم کو مطمئن کرتے ہوئے کہا کہ آپ یقین کیجئے کہ آپ کی جو قدر و منزلت میری نظروں میں اب تک تھی آج اس سے دوبالا ہوگئی۔ آپ نے گناہ ضرور کیا ہے۔ مگر جس طرح آپ اپنے اس گناہ کا اعتراف اور اقبال کر لیتے ہیں اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب تک آپ میں وہ تمام معصومیت موجود ہے۔ جو اس قسم کا گناہ کرنے کے بعد پاش پاش ہو جانا چاہئے تھی۔ بیوی سے بیان کر چکنے کے بعد اور اپنے گناہ کی تھوڑی بہت سزا خود اپنے کو دے کر ہم مطمئن ہو گئے۔ ہم ان صاحبہ کا نام لکھنے کا حق اب بھی نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ حالات ہم اپنے لکھ رہے ہیں۔ ان کو بے نقاب کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ وہ اب نہایت خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہوں گی۔ ہم ان کے پھولوں میں کانٹے بونا نہیں چاہتے۔

تاش اور بازیاں

رفیع احمد خاں صاحب کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ تاش کھیلنا بھی تھا۔ وہ روپے لگا کر تاش کھیلا کرتے تھے کبھی فلش کبھی بینک کبھی نیپ یعنی کٹی اور آخر میں رمی۔ ہم تاشوں کے کھیل میں اب تک سوائے غلام چور کے کوئی کھیل کے نہ جانتے تھے۔ چانس بھی آتی تھی۔ مگر بھول سے گئے تھے۔ مگر چونکہ خاں صاحب کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ لہذا وہ کھیلا کرتے تھے اور ہم بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ ہم سے جب کبھی کھیلنے کے لئے کہا ہم نے ہمیشہ یہی کہا کہ بخشئے۔ اس خاکسار کو۔ مگر رفتہ رفتہ کھیل اس قدر سمجھ گئے تھے کہ کھیلنے میں ان کو مشورہ دینے لگے کہ

کہ یہ پتا نہیں۔ یہ پتّا پھینکو اور ایک چال نہیں، دو چالیں چلو وغیرہ یہاں تک کہ ایک دن خان صاحب ہم کو بھی تاش کھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ نیا جواری ہمیشہ جیتا کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے ہی دن دو روپے کا سرمایہ لگا کر ہم نے چوبیس روپے جیتے۔ اب کیا تھا۔ چسکا پڑ گیا۔ روز خان صاحب کے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ اور روز کھیل رہے ہیں۔ شروع شروع میں خوب جیتے اور یہ یقین ہو گیا کہ ہم تاشوں کے معاملہ میں نہایت خوش قسمت ہیں مگر جب عادت اچھی طرح پڑ چکی تو اب ہار شروع ہوئی۔ اور ہارے بھی ایسا کہ طبیعت ہار ہی گئی۔ محدود آمدنی اور یہ شوق۔ نتیجہ یہ کہ ادھر ادھر سے قرض لینا شروع کر دیا اور ایک مرتبہ تو پوری تنخواہ ہار جانے کے بعد مجبوراً ہم کو نسیم انہونوی سے کہنا پڑا کہ ہم کو جس طرح بھی ہو سکے کسی سے تنخواہ کے برابر ایک رقم قرض دلوا دو، ہم تھوڑی تھوڑی کر کے ادا کر دیں گے۔ نسیم بیچارے کے پاس خود روپیہ موجود نہ تھا لہٰذا ایک سود خوار آغا سے پرونوٹ پر روپیہ قرض لے کر بیوی کو جا کر تنخواہ دی۔ تاکہ اس غریب کو پتہ نہ چلے کہ اس کے "معصوم" شوہر نے کیا حرکتیں شروع کر رکھی ہیں۔ ورنہ اسے بہت صدمہ ہو گا۔ مگر اب ہر مہینے ہم صرف سود دیا کرتے تھے اصل دینے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ اس لیے کہ اصل کی ادائیگی کے لیے ہم کو کسی دن راجہ نل کی مہربانی کا انتظار تھا۔ مگر وہ ہارنے والوں پر ذرا کم ہی مہربان ہوتے ہیں۔ ہارے ہوئے روپے کو واپس لانے کا خیال اور بھی ہراتا ہے۔ اور کھیل چھوٹنے نہیں دیتا یہ امید کہ کیا اب ہمیشہ ہارتے ہی جائیں گے۔ کھیل سے ہاتھ اٹھانے نہیں دیتی۔ نتیجہ یہ کہ سلسلہ در سلسلہ اور زنجیر در زنجیر قسم کا مشغلہ بن جاتا ہے۔

بیوی سے لڑائیاں

اس تاش کے مشغلہ میں آدھی آدھی رات تک اور کبھی کبھی ساری ساری رات مشغول رہنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ کھیلنے بیٹھ گئے۔ پھر ہوش نہ رہتا تھا کہ وقت کتنا گزر گیا۔ کبھی رات کو دو بجے آئے اور بیوی سے کہہ دیا کہ ایک مشاعرے میں پکڑے گئے تھے۔ کبھی ایک بجے آئے اور کہہ دیا کہ ایک جلسہ میں جانا پڑ گیا تھا۔ کسی رات دو بجے آئے اور تھیٹر کا بہانہ کر دیا۔ مگر اب یہ روز کا مشغلہ تھا۔ اور روز نئے بہانے درکار تھے۔ وہ بیچاری کچھ دن تو یقین کرتی رہی مگر اس کے بعد ایک فکر یہ پیدا ہو گئی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کبھی اس طرح غائب نہ رہتے تھے۔ اور اب تو کسی رات بھی صحیح وقت پر نہیں آتے۔ اگر کسی رات بارہ بجے آگئے تو گویا یہ سرِ شام آجانا سمجھا جاتا تھا۔ ایک مصیبت اور تھی کہ ہم تو خیر اس ،، کارِ خیر میں جاگتے تھے مگر بیوی کو اس وحشت میں نیند ہی نہ آتی تھی۔ ان کی ساری شگفتگی ختم ہو کر رہ گئی تھی ان کی مشکوک نظریں ہم پر پڑنے لگی تھیں۔ اور جاگتے جاگتے۔ اور ان ہی فکروں میں گھلتے گھلتے۔ وہ واقعی کچھ بیمار سی رہنے لگی تھیں۔ اور مزاج میں کچھ چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ آخر اب وہ ہم سے لڑنے لگی۔ اور گھر پر ایک باقاعدہ مورچہ ہمارے خلاف قائم ہو گیا۔ ادھر سے جھوٹے اور ادھر سے سچے شکوے، احباب کے طعنے، ہمارے بگڑ جانے اور بری راہ پر پڑ جانے کے یقین کا اظہار۔ اپنی بے کسی اور بے بسی کا رونا۔ آنکھوں میں آنسو چہرے پر شوہر کی بیوفائی کا زرد غازہ، مختصر یہ کہ یہ سب کچھ تھا مگر خدا جانے یہ تاشوں کا بھوت کس قباحت کا تھا کہ ہم باوجود انتہائی کوشش

کے سنبھلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ تاش کے ہر کھیل کے بعد توبہ کرکے اٹھتے تھے۔ مالی نقصان بیوی سے خراب تعلقات، اخلاقی خسارہ، اس سب پر اس وقت نظر جاتی تھی۔ اور ہم گویا عہد کرلیتے تھے۔ کہ اب کبھی تاش نہ کھیلیں گے۔ مگر دوسرے ہی دن جہاں آفتاب غروب ہوا۔ راجہ نل نے کان پکڑے اور ہم کو وہیں پہنچا دیا جہاں نہ جانے کا ہم فیصلہ کرچکے تھے۔ روز کا یہی قصہ تھا۔ روز توبہ اور روز شکستِ توبہ۔ پھر مصیبت یہ تھی کہ خود ہم نے جاگ جاگ کر اور ہار ہار کر اپنا مزاج خراب کرلیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بیوی بیچاری پر غصے شروع کردیئے۔ وہ تو ہمارے قصور پر ہم سے خفا تھی۔ اور ہم اس بے گناہ سے اس طرح لڑتے تھے۔ گویا یہ آزادیاں ہمارا حق تھیں۔ اور ان میں مداخلت کا اسے کوئی حق نہ تھا۔ میاں بیوی کے درمیان ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہوچکی تھی جس کے فاصلہ کا اندازہ تاش کے باون پتوں کو برابر برابر رکھ کر کیجیے۔

قمار بازی کے انجکشن

اسی زمانہ میں ہمارے داہنے کان کے نیچے ایک ورم سا پیدا ہوگیا جو کچھ ہی دنوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ مگر ورم بڑھتا جاتا تھا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تو معلوم یہ ہوا کہ یہ دراصل گنٹھمالے کا مادہ ہے اور اس کا ابھی علاج نہ ہو تو اس کے بڑھ جانے کا پورا خطرہ موجود ہے۔ والدہ صاحبہ یہ سن کر بے حد پریشان ہوگئیں اور ہماری منہ بولی خالہ اماں بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب نے کہا کہ میاں اس کا جم کر علاج کرلو اور اخراجات کی

پروا نہ کرو۔ جو صرف ہوگا۔ میں دوں گی۔ ہم نے ان کو بتایا کہ ڈاکٹر بیس بائیس انجکشن لگانے کو کہتے ہیں۔ اور ہر انجکشن پندرہ روپے کا ہوگا۔ خالہ اماں نے کہا تم یہ انجکشن فوراً لگوالو۔ اور اس سلسلہ میں غفلت نہ برتو۔ چنانچہ اب ایک دن بیچ کر کے پندرہ روپے کا انجکشن اس طرح لگنے لگا۔ کہ ہم روپے لے کر جاتے تھے تاش کی بازی میں لگا دیتے تھے۔ اور ہار کر یا کبھی کبھی جیت کر گھر آجاتے تھے۔ کچھ دن تو ہر انجکشن کی قیمت ہم کو ملی۔ اس کے بعد پورے کورس کا روپیہ خالہ اماں نے بھجوا دیا۔ اور ہم نے نہایت رئیس بن کر اس زمانہ میں تاش کھیلے اور کبھی ایک انجکشن بھی نہ لیا۔ مگر یہ بھی خدا کی شان ہے۔ کہ وہ ورم رفتہ رفتہ ہو کر بالکل ختم ہو گیا۔ اور سب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ کرامت ان ہی انجکشنوں کی ہے۔

تاش کا جواز

ہم دیکھتے تھے کہ تاش کے کھیل کو ہماری بیوی نہایت حقارت سے جوا کہا کرتی ہیں۔ مہذب طبقہ کا ایک معمولی مشغلہ ہے۔ تمام تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے شریف زادے اس کو بغیر کسی قسم کا کوئی عیب سمجھے روزانہ کلب میں جاری رکھتے ہیں۔ گھروں پر کھیلتے ہیں اور ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ہم نے جو ایک دن اپنے گھر پر احباب کو جمع کر کے تاش کھیل لئے تو بیوی سے یہ بھی نہ دیکھا گیا اور ہم کو جواری کا نہایت تکلیف دہ خطاب دے دیا۔ ان کو دراصل اب تک اس کی اطلاع نہ تھی۔ کہ ہم روز اسی مشغلہ میں مصروف رہتے ہیں یہی ہے وہ مشاعرہ

یہیں تک ہے۔ وہ جلسہ اور یہی ہے۔ وہ تھیٹر جس میں ہم کو روز آدھی رات تک اور کبھی ساری ساری رات مصروف رہنا پڑتا ہے۔ ہم نے گھر پر امتحاناً تاش کھیلے تھے کہ اگر بیوی نے مناسب نہ سمجھا تو بجائے اس کے کہ ہم گھر سے غائب رہیں گھڑی پر سب کو جمع کر لیا کریں گے۔ مگر وہ تو تاشوں کا نام سن کر آگ بگولا ہو گئیں۔ اور اس قدر بیزاری کا اظہار کیا اور ایسا لڑیں کہ ہم نے آئندہ کے لیے کان پکڑ لیے کہ اب کبھی گھر پر تاش نہ کھیلیں گے حالانکہ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ تاش کے کھیل کو جوا نہیں کہتے۔ تاشوں کے کھیل میں بازی لگا کر کھیلنا مہذب دنیا جائز قرار دے چکی ہے۔ بڑے بڑے وکیل اور بیرسٹر جج اور دوسرے حکام سب ہی تاش کھیلتے ہیں۔ ہر کلب میں تاش ہوتا ہے۔ اور تاش کے کھیل کی مخالفت جہالت کی نشانی سمجھی جاتی ہے مگر وہ اس جہالت کے لیے تیار ہو گئیں۔ اور تاش کی مخالفت اور تاش سے نفرت میں کوئی فرق پیدا نہ کر سکیں۔ بلکہ ان کو اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ہماری گمشدگیاں اسی تاش کی بدولت ہیں۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور دامن پھیلا پھیلا کر ہمارے دوستوں کو کوسا کرتی تھیں۔ اور ہم اس انتظار میں تھے کہ یہ ہم سے مایوس ہو جائیں تو اچھا ہے مگر اللہ ری وضعداری کہ ہر روز اسی دم خم سے رات کو دیر میں آنے پر لڑتی تھیں آدھی رات کو گھر میں ایک ہنگامہ ہوتا تھا۔ نئے عہد و پیمان ہوتے تھے۔ توبہ کی جاتی تھی۔ اور دوسری رات کو پھر وہی۔

روزنامۂ ہند

اخبار سرپنچ بھی نکل رہا تھا اودھ اخبار میں ہم ملازم بھی تھے اور تاشوں

کی یہ قیامت خیز مصروفیت بھی تھی کہ اسی زمانہ میں روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر مسٹر رام لال ورما نے لکھنؤ آکر ایک لمیٹیڈ کمپنی قائم کرکے ایک باقاعدہ روزنامہ جاری کرنیکا فیصلہ کرلیا چنانچہ لکھنؤ میں آکر آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ لمیٹیڈ کمپنی قائم ہوگئی پریس خریدا گیا۔ اور "ہند" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کرنے کے لیے ڈیکلریشن داخل کردیا گیا۔ ورما صاحب نے ابن سلونوی صاحب کی معرفت ہم کو اپنے اخبار کے عملہ میں آجانے کی دعوت دی۔ تنخواہ اودھ اخبار سے زیادہ تھی۔ دوسرے اودھ اخبار کی اس بے انصافی سے ہم بددل بھی ہوچکے تھے۔ کہ سال بھر تک ہم سے باقاعدہ ایڈیٹری کرائی۔ تنخواہ میں کوئی اضافہ یا قائم مقامی کا کوئی مزید الاؤنس بھی نہیں دیا اور پھر ایک دوسرے ایڈیٹر کو بلا کر ہم کو ہماری جگہ واپس کردیا ان حالات کے ماتحت ہم نے روزنامہ ہند کی اس دعوت کو منظور کرلیا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ایک اپٹوڈیٹ قسم کا باقاعدہ اخبار ہوگا۔ جس میں ذمہ دارانہ کام کرنے کا موقع ملے گا اور کیا تعجب ہے کہ اسی بہانے ہم سے یہ تاشوں والی بری عادت بھی چھوٹ جائے اور واقعی نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ روزنامہ ہند میں اپنے کام کا چارج لینے کے بعد ہم بے حد مصروف ہوگئے۔ ہم کو اخبار کا نائٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رات کو نو بجے دفتر جاتے تھے۔ اور صبح چار پانچ بجے تک کام کرتے تھے۔ تمام رات تاروں کا سلسلہ قائم رہتا تھا۔ اور ہم اپنے اسٹاف کے ساتھ ان تاروں کے ترجمے کرتے۔ کاتبوں سے ان کو لکھواتے اور صبح چار بجے خبروں کی کاپی جڑوا کر پریس کے حوالے کردیتے تھے۔ اور گھر آجاتے تھے۔ خبروں کے اس کام کے علاوہ شذرات اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے دن کو تھوڑی دیر کے لئے دفتر جانا پڑتا تھا۔ مگر یہ تھوڑی دیر اکثر

اس قدر طول کھینچ جاتی تھی۔ کہ چوبیس گھنٹہ کی مسلسل ڈیوٹی کی نوبت آجاتی تھی مگر اب ہم کو اطمینان تھا۔ ایک تو یہ کہ تماشوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بیوی کو اب ہماری طرف سے یہ اطمینان ہو چلا تھا بلکہ اب ہم پر ترس آنے لگا تھا کہ کہیں اس قدر شدید محنت کا کوئی ناگوار اثر صحت پر نہ پڑ جائے۔ جتنا وقت تھا۔ وہ صرف دو کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ دفتر میں کام کرنا یا گھر پر سونا اخبار واقعی بہت شاندار تھا۔ اور انتظامات اس قدر ٹھاٹھ کے تھے کہ ہم کو اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی باقاعدہ اخبار میں کام کر رہے ہیں۔ اور اخبار نویسی جس کو کہتے ہیں۔ وہ دراصل اب شروع ہوئی ہے۔ رام لال صاحب ورما کو ہم پر بے حد اعتماد تھا۔ اور وہ ہمارے کام سے نہایت خوش تھے۔ مگر ان میں تمام تمام خوبیوں کے باوجود بھی اسٹاف کے ایک صاحب نے ہمارے خلاف ان کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ اور ان کی رائے خراب ہونے لگی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کھنچے کھنچے سے رہنے لگے۔ مگر قبل اس کے کہ یہ اختلاف سامنے آئے روزنامہ ہند کی زندگی کے دن پورے ہوتے نظر آئے۔ لمیٹیڈ کمپنی تو تھی ہی۔ ساجھے کی ہانڈی اس کا چوراہے پر ٹوٹنا ضروری تھا۔ کچھ حصہ داروں نے وعدہ کرنے کے باوجود اپنے حصے کی رقم نہیں دی۔ کچھ نے اخبار کی پالیسی میں مداخلت کرنا چاہی۔ مختصر یہ کہ تھوڑے دنوں میں ایسی گڑبڑ پیدا ہوئی کہ اخبار بند۔ تنخواہ غائب اور ہم پھر گھر پر۔

پنجاب کا پہلا سفر

کسی کو کلکتہ اور بمبئی دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ کسی کو کشمیر جنت نظیر کی زیارت

کی تمنا۔ مگر ہم کو نہ معلوم کیوں ہمیشہ سے لاہور دیکھنے کی تمنا تھی۔ بچپن ہی سے لاہور میں ہمارے لئے خدا جانے کیا کشش تھی کہ ہمیشہ لاہور جانے کو دل چاہا۔ مگر یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی۔ مگر جب اس تمنا کے بر آنے کا وقت آیا تو اچانک پوری بھی اس طرح ہو گئی کہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے فرمایا۔ چلتے ہو پنجاب؟ دل نے کہا نیکی اور پوچھ پوچھ۔ وہ لاہور سے بھاوج صاحبہ مسز عمر کو لینے جا رہے تھے اور ارادہ تھا کہ راستہ میں قادیان بھی ٹھہریں گے۔ چنانچہ ہم ان کے ہمرکاب ہو گئے۔ امرتسر پہنچ کر ہم لوگ قادیان کی طرف مڑ گئے۔ قادیان پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب ڈلہوزی تشریف لے گئے ہیں پھر بھی تمام دن قادیان ہی گزرا۔ قادیان کے مختلف شعبے سرسری طور پر دیکھے بہشتی مقبرہ دیکھا۔ اخبار الفضل کے دفتر گئے۔ قاضی اکمل صاحب سے ملے۔ اور سہ پہر کو یہ سن کر کہ آج ہی حضرت صاحب ڈلہوزی سے شملہ جاتے ہوئے امرتسر سے گزریں گے ہم لوگ واپس امرتسر آ گئے۔ اور امرتسر میں حضرت صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ خیال تھا کہ ہم کو دیکھتے ہی احمدیت کی تبلیغ شروع کر دیں گے۔ ہم کو بیعت کی دعوت دی جائے گی اور ہم جب انکار کریں گے تو ڈاکٹر صاحب کو ہدایت دی جائے گی کہ ان کو جماعت کا لٹریچر پڑھنے کو دیا جائے۔ مگر وہاں احمدیت کا کوئی ذکر تھا نہ بیعت کا کوئی سوال نہ کوئی ایسی بات جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ہم کو غیر احمدی سمجھا جا رہا ہے۔ اور احمدی بنانے کی تحریک ہو رہی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے حضرت صاحب نے کچھ ادبی اور کچھ شاعرانہ گفتگو چھیڑ دی۔ تاکہ ہم کو دلچسپی ہو سکے۔ سب نے مل کر ریفریشمنٹ روم میں ہندوستانی کھانا کھایا اور اس

کے بعد حضرت صاحب شملہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس پہلی ملاقات میں ان کی گفتگو کا رخ زیادہ تر سیاسیات کی طرف تھا۔ اور ہم صرف یہ اندازہ کر سکے کہ ان کی مذہبی حیثیت تو درکنار ان کی سیاسی حیثیت بھی نہایت بلند ہونا چاہئے جو عمیق نظر ان کی سیاست کی باریکیوں پر پڑ رہی تھی۔ وہ صرف ایک مشاق ماہر سیاست کی ہو سکتی تھی۔ ادبی معاملات میں جو گفتگو آپ نے فرمائی وہ خالص ادبی رنگ لئے ہوئے تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایک منجھا ہوا ادیب یہ باتیں کر رہا ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ نگاہیں نیچی، لبوں پر تبسم اور آواز میں ایک دلکشی غالباً ان ہی باتوں کو غیر احمدی قادیانیوں کی جادوگری کہتے ہوں گے۔

لاہور کی سیر

امرتسر سے رخصت ہو کر ہم لوگ لاہور پہنچے، ڈاکٹر صاحب اپنی سسرال میں اور ہم اپنے دوست میاں ایم اسلم کے یہاں ٹھہر گئے۔ اسلم صاحب نے مدارات کی حد کر دی۔ لاہور میں ہمارے لئے لکھنؤ تک کے آم فراہم کر دیئے۔ بات بات پر سکنجبین، پھلوں کے عرق اور دسترخوان بالکل واجد علی شاہی۔ آپ ہی کے یہاں سب سے پہلے پنڈت ہری چند اختر، دورخی علم الدین سالک، اور غالباً ڈاکٹر تاثیر سے ملاقات ہوئی۔ اور خود جا کر سید امتیاز علی صاحب تاج شمس العلماء مولوی ممتاز علی صاحب، اور عبدالمجید صاحب سالک سے ملے پھر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جہانگیر کا مقبرہ۔ شالا مار باغ۔ ڈاکٹر اقبال اور سر عبدالقادر کو دیکھا ان دونوں بزرگوں کا ذکر تاریخی مقامات کے ساتھ اس لئے آ گیا ہے کہ یہ حضرات بجائے خود

تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔

سر محمد اقبال

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سر عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال کے یہاں پہونچے۔ سر عبدالقادر سے جتنی دیر گفتگو ہوتی رہی آپ نے ایک مرتبہ بھی یہ اندازہ نہ ہونے دیا کہ آپ پنجابی ہیں۔ ان کا بالکل صحیح تلفظ اور لب و لہجہ میں اردو سے مغائرت نہیں جو عام طور پر پنجاب میں نظر آتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ آپ ایک مقدمہ میں کچھ مصروف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں ٹھاٹھ بھی کچھ دوسرے تھے۔ نام کے ساتھ سر ضرور لگا ہوا تھا۔ مگر وضع عجیب درویشانہ تھی۔ ایک تہبند باندھے دو تین حاضرین سے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے اور حقہ چل رہا تھا۔ حاضرین میں ایک صاحب ہمارے بھی جانے والے تھے یعنی محمد عسکری صاحب مجاز لکھنوی آپ خدا کے منکر اور مذہبیات میں ایک انقلاب عظیم کے علمبردار تھے۔ لوگ ان کو مجذوب سمجھا کرتے تھے ہم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ لاہور کب اور کیسے تشریف لائے۔ سر محمد اقبال نے زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا کہ آپ میری زبان درست کرنے اور مجھ کو زبان کے سلسلہ میں مشورے دینے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ مجاز صاحب نے انکساری کے ساتھ تبسم فرمایا۔ گویا ڈاکٹر صاحب سچ کہہ رہے ہیں۔ مگر بندہ کس قابل ہے اس وقت تو ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی لیکن دوسرے دن ہم چپکے سے پھر حاضر ہوئے۔ مگر اس وقت بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے

یہاں اس وقت موضوعِ بحث یہ تھا کہ فحشیات اردو زبان کے لٹریچر سے جواب تک باہر تھیں یہ عنصر کھلم کھلا سامنے آچکا ہے۔ اسی بحث کے سلسلہ میں ہم نے ڈاکٹر صاحب کو رفیع احمد خاں کا ایک شعر اسی رنگ کا سنایا۔ ڈاکٹر صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شعر پھر پڑھنے کی فرمائش فرمائی۔ اور آخرکار باقی حضرات سے رخصت ہو کر ہم کو جانے کی اجازت نہ دی اور حکم دیا کہ ان صاحب کے اور شعر یاد ہوں تو سناؤ۔ ہم نے کافی شعر سنائے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بڑی خیریت ہوئی کہ یہ حضرت اس طرف متوجہ ہو گئے۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ عام شاعری فرماتے تو بہت سے شاعروں کا پتہ نہ چلتا کہ کیا ہوئے۔ اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔

پھر سرپنچ

سرپنچ تو اپنا تھا ہی۔ مگر اب تک سرپنچ سے کسی قسم کا کوئی مالی معاملہ سوائے اس کے نہ ہوا تھا کہ جس مکان میں ہم رہتے تھے۔ اس کا کرایہ دفتر کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ مگر مہدی کے بعد تو گویا سرپنچ کو ہماری پوری کفالت کرنا تھی۔ چنانچہ نسیم صاحب سے باقاعدہ معاملات طے ہوئے۔ اور ہم نے سرپنچ کی ذمہ دارانہ خدمات انجام دینا شروع کر دیں۔ اب تک سرپنچ ہمارا تھا۔ اور اب ہم سرپنچ کے ہو گئے۔ مگر سرپنچ کی مالی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ وہ یہ ہاتھی باندھ سکتا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ روپیہ ہم کو دفتر سے حسب قرارداد ملتا رہتا تھا۔ اور ہم کو کوئی خاص تکلیف نہ تھی۔ گھر کی فضائیں بھی درست تھیں۔ بیوی کو اب ہماری غیر حاضریوں کا شکوہ نہ

تھا۔ مگر وہ جو اطمینان ان تمام واقعات سے پہلے ان کو ہماری طرف سے تھا۔ وہ اب باقی نہ رہا تھا۔ اور وہ برابر شکوک کی نظروں سے ہم کو دیکھا کرتی تھیں کون جانے یہ حضرت کب پھر اسی راستہ پر لگ جائیں۔ وہ تو وہ ہم خود اپنے ارادوں میں کچھ مستقل نظر نہ آتے تھے۔ رفیع احمد خاں سے ملاقاتیں اب بھی ہوتی تھیں مگر وہ ہر وقت کا ساتھ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ ہم اس دور کی تلافی کرنا چاہتے تھے مگر تلافی کر سکیں گے یا نہیں اس کا ہم کو ابھی تک یقین نہ تھا

رسالہ شباب

نسیم صاحب کے پاس اگر کہیں ان کے حوصلہ کے برابر روپیہ بھی ہوتا تو یہ بلا کا ازخود رفتہ انسان نہ جانے کہاں پہنچتا۔ کبھی پیسہ کوڑی کی تنگی آڑے آئی ورنہ پھر آگے ان حضرت نے پچھلے کہ لوگ یہ سن کر حیران رہ جاتے تھے کہ نسیم سرمایہ دار نہیں بلکہ مزدور ہیں۔ سرپنچ کے جو سالنامے آپ نے نکالے ہیں، وہ ممکن ہے کہ پنجاب کے ہزاروں کے لیے معمولی بات سمجھے جائیں۔ مگر یو پی میں یہ حوصلہ صرف ان ہی حضرت کے حصے میں آیا تھا۔ حریم کے خاص نمبر نکالنا ان کے لیے ایک عام بات ہو کر رہ گئی تھی۔ اب آپ سرپنچ کا ایک ماہوار فلم ایڈیشن بھی نکال رہے تھے جو باقاعدہ ایک مصور رسالہ تھا۔ اور اس کا سالنامہ تو ایسا نکالا تھا کہ آج تک اس کی دھوم ہے۔ اسی زمانہ میں آپ کو یہ بھی سوجھی کہ ایک خالص ادبی قسم کا ماہنامہ نکالا جائے۔ نام تجویز ہوا شباب۔ ایڈیٹر ہوئے یہ۔ شباب کی حدود سے عنقریب گذرنے والے شوکت تھانوی۔ نسیم صاحب کے زیر اہتمام

کوئی سیکنڈ کلاس چیز نہیں نکل سکتی تھی۔ نہایت شاندار یہ رسالہ بھی نکلا چوٹی کے لکھنے والوں نے مضامین دیئے۔ لوگوں نے بڑی بڑی توقعات اس رسالہ سے بھی وابستہ کر لیں اس لیے کہ یہ بھی سرپنچ جرنلس کا ایک شگوفہ تھا۔ چار پانچ نمبر بڑی دھوم سے نکلے مگر اس کا نہایت ناگوار اثر سرپنچ پر پڑنے لگا اور آخر کار طے یہ کرنا پڑا کہ سرپنچ اور شباب دونوں میں سے کسی کو کس پر قربان کر دیا جائے۔ آخر سرپنچ پر ہم نے اپنا شباب قربان کر دیا۔ اور لوگوں سے کہہ دیا کہ بوڑھے منہ پہ مہاسے۔ اچھے نہ معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ لوگوں کے لیے یہ تماشہ بھی بے حد دلچسپ تھا۔

ریڈیو ٹاکر

اسی زمانہ میں دہلی سے مولوی محمد حسین آزاد کے نواسے آغا محمد اشرف صاحب جو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھے۔ سرکاری طور پر دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ بھی تشریف لائے اور ہم کو ڈھونڈ کر ہمارے پاس پہنچے آپ نے ہم کو دہلی سے ایک آدھ تقریر براڈکاسٹ کرنے کے لیے کنٹریکٹ فارم پر دستخط کرائے اور آخر ہم تاریخ پر دہلی سے براڈکاسٹ کرنے پہنچ گئے۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر جانے کا صرف پہلا اتفاق ہی نہ تھا بلکہ خواہ کوئی کتنا ہی بیوقوف کیوں نہ سمجھے ہم کو یہ عرض کرنے میں شرمانا نہ چاہئے کہ اب سے پہلے ہم نے کبھی ریڈیو تک نہ سنا تھا۔ مگر اب ریڈیو سننے والوں کو اپنی آواز سنانا چاہتے تھے۔ یہاں آغا اشرف صاحب کے علاوہ اسرار الحق صاحب مجاز سے بھی ملاقات ہوئی۔ جو رسالہ آواز یعنی ریڈیو کے اردو رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ اور جن سے ہم پہلے ہی لکھنؤ اور دہلی

میں متعدد بار مل چکے تھے۔ مجاز صاحب نے اسی وقت ہم کو ذوالفقار صاحب بخاری اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ملایا۔ جو خصوصیت کے ساتھ ہم سے ملے اور اسی دن شام کو نئی دلی کے نہایت شاندار ہوٹل میں ہم کو چاء پر مدعو کر دیا۔ بخاری نہایت تیز ذہین اور ساتھ ہی ساتھ اپنی چلت پھرت سے خاص طور پر ریڈیو کے لئے موزوں ترین شخصیت ثابت ہوئے آپ سے شام تک اس حد تک بے تکلفی ہو چکی تھی کہ آپ نے اپنا کلام بھی سنایا۔ اور ہر طرح ہم کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ ریڈیو میں ہمارے لئے کوئی اجنبیت نہیں ہونا چاہئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان سے آج ہی ملاقات نہیں ہوئی ہے بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔ ہم نے مقررہ وقت پر اپنی تقریر براڈکاسٹ کی۔ چک لیا اور چلے آئے۔ پندرہ دن کے بعد دوسری تقریر تھی۔ اس موقع پر بھی بخاری صاحب بہت ہی خصوصیت سے پیش آئے۔ اس روز ہم تقریر ختم کرکے اسٹوڈیو سے نکلے تو ہم کو اطلاع دی گئی کہ فیاض احمد صاحب کوئی بزرگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور ملاقات کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ہم نے دماغ پر لاکھ لاکھ زور دیا کہ ہمارے کس دوست کا نام فیاض احمد ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اب جو ملاقات کے کمرے میں پہنچتے ہیں تو چچا میاں تشریف فرما تھے بڑے پیار سے فرمایا۔ شیطان کہیں کا۔ میں تیری شرارتیں سن رہا تھا۔ ابھی دہلی آیا ہوا تھا۔ سنا کہ تم بھی یہیں ہو۔ تم سے ملنے آگیا۔ چچا میاں سے تقریباً آٹھ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ ان ہی کے ساتھ ان کی ہمشیرہ نسبتی کے یہاں گئے۔ رات کا کھانا وہیں کھایا۔ اور یہ وعدہ کرلیا کہ اب کی مرتبہ آیا تو آپ کو اطلاع کر دوں گا چنانچہ اب یہ معمول ہو گیا کہ دہلی آنے سے پہلے اپنے براڈکاسٹ کی تاریخ کی اطلاع

تھانہ بھون بھیج دیتے تھے۔ اور وہاں سے چچا میاں دہلی آجایا کرتے تھے

بیوی سسرال گئیں

ہماری والدہ صاحبہ نے ایک ریکارڈ قائم کیا تھا۔ یعنی شادی کے بعد سے بیوگی تک کبھی آپ اپنی سسرال تشریف نہیں لے گئیں۔ اور نہ والد صاحب ان کو لے گئے۔ اس لئے کہ خود ان کو اپنے گھر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ کہنے ہی کے تھے کہ میں جس شان کے ساتھ بیوی کو تھانہ بھون لے جانا چاہتا ہوں۔ اس کا امکان ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہ ان کو لے کر جاؤں۔ مختصر یہ کہ وہ اس امکان کا انتظار کرتے ہی کرتے اپنے حقیقی وطن روانہ ہوگئے۔ اور والدہ صاحبہ میکے ہی میں سہاگن بن کر میکہ میں بیوہ بن کر رہ گئیں۔ اور رخصتی کی گویا کبھی نوبت ہی نہ آئی۔ مگر اس سلسلہ میں ہماری بیوی تیز نکلیں۔ ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ چچا میاں ہر براڈکاسٹ کے موقع پر دہلی آجایا کرتے ہیں۔ اور کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ دلہن اور بچوں کو لے کر آؤ۔ تھانہ بھون۔ تو ایک مرتبہ آپ ہمارے ساتھ دہلی چلنے کو تیار ہوگئیں اور پروگرام یہ بنایا کہ دہلی کی سیر، وہاں سے مظفر نگر کی روانگی جہاں ان کے عم محترم اور ہمارے برادر محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب صدر استپال کے انچارج تھے اور پھر مظفر نگر سے تھانہ بھون کی روانگی۔ چنانچہ دہلی پہنچ کر آپ نے پہلے تو دہلی کے سیر سپاٹے کئے۔ کبھی جامع مسجد میں ہیں۔ تو کبھی چاندنی چوک میں۔ کبھی قطب مینار کی سیر ہو رہی ہے۔ تو کبھی اوکھلے کی اور آخر شام کو جب ہم براڈکاسٹ کرنے پہنچے تو آپ ہمارے ہمراہ ریڈیو اسٹیشن پر بھی موجود تھیں۔ اور ریڈیو اسٹیشن کا معائنہ

کرنا چاہتی تھیں۔ یہ بھی دیکھنا منظور تھا کہ براڈکاسٹ کرتے وقت ان کا شوہر کیا معلوم ہوتا ہے اور اس کو آخر کس مشین میں رکھ دیا جاتا ہے۔ کہ یہ بولنے لگتا ہے تحقیقات پر معلوم ہوا کہ کوئی صاحب ہیں مہرا۔ جو ڈیوٹی پر ہیں۔ وہی ریڈیو اسٹیشن کی سیر کرادیں گے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ برادرم جگل کشور صاحب مہرا سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے نہایت خشک مگر نہایت مہذب طریقہ پر ریڈیو اسٹیشن کی سیر بیوی کو کرائی ایک ایک بات سمجھائی کہ اس طرح براڈکاسٹ کیا جاتا ہے۔ یوں آواز ٹرانسمیٹر تک جاتی ہے۔ اور وہاں سے اس طرح نشر ہو جاتی ہے۔ جگل صاحب کے متعلق اس روز ہم صرف یہی رائے قائم کر کے رہ گئے۔ کہ یا تو یہ حضرت نہایت آدم بیزار ہیں۔ ورنہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہیں۔ اخلاقاً بھی تو آپ کے چہرے پر ہنسی نہ آئی۔ حالانکہ ہم نے زندگی بھر شاید ہی کسی کے متعلق اتنی غلط رائے قائم کی ہو۔ جتنی جگل صاحب کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی۔ وہاں تو بیزاری کا سوال ہی نہیں باغ و بہار قسم کا ایک ایسا دوست جو بجائے خود ایک انجمن کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہرحال جگل صاحب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے ان کے متعلق تو بہت کچھ کہنا ہے جو آئندہ کہا جائے گا۔ مختصر یہ کہ دہلی کے اس تمام سیر سپاٹے کے بعد بیگم صاحبہ ہمارے اور اپنے خسر محترم یعنی چچا میاں کے ساتھ مع دونوں بچوں کے مظفر نگر روانہ ہو گئیں۔

مظفر نگر کے اسٹیشن پر عجیب منظر ہمارے سامنے تھا۔ ایک طرف تو ڈاکٹر محمد عمر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کو لینے۔ دوسری طرف خان بہادر تنویر عنا علی صاحب کے یہاں سے ایک پردہ دار کار آئی تھی چچا میاں کی بہو کو اتارنے

چنانچہ چچا میاں نے اپنے زیر اہتمام پلیٹ فارم پر چادریں تنوانا شروع کر دیں ڈاکٹر صاحب نے ایک منٹ تو یہ تماشا دیکھا اور اس کے بعد چچا میاں سے کہا "سنئے جناب یہاں یہ میرے یہاں آئی ہیں۔ اور میرے طریقہ پر میرے ساتھ جائیں گی جب آپ تھانہ بھون لے جائیں۔ اس وقت آپ کو اختیار ہے" یہ کہہ کر سعیدہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی کھلی کار پر لے کر انہیں اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ چچا میاں خاموش رہ گئے۔ مظفر نگر میں اپنے والد کے احباب اور چچا میاں کے دوستوں سے مل کر اور ایک آدھ دعوت کھا کر تیسرے روز بذریعہ کار تھانہ بھون روانہ ہو گئے۔ جہاں جانے کی میرے بچوں کو اس قدر خوشی تھی کہ چھوٹا بچہ خورشید تمام راستہ کار کے سامنے والے ہر مویشی سے چیخ کر کہتا تھا "ارے گائے ہٹا ہم دادی کے پاس جا رہے ہیں۔"

تھانہ بھون

تھانہ بھون آنے کا ہمارے لئے یہ دوسرا اتفاق تھا۔ اور بیوی بچوں کے لئے پہلا اتفاق۔ پہلی مرتبہ بہت ہی کم سنی میں آئے تھے۔ ہماری چچی بھی دوسری تھیں اور تھانہ بھون کے دوسرے حالات تو درکنار چچی تک بدل چکی تھیں۔ ہمارے ساتھ اس وقت وہ چچی نہایت محبت سے پیش آئی تھیں۔ اور اب یہ چچی بہت ہی محبت سے ہماری بیوی اور بچوں کے ساتھ پیش آ رہی تھیں۔ تھانہ بھون کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا ایک غریب الوطن بھائی تھانہ بھون آیا ہے۔ تو ایک اجتماع سب نے مل کر کیا۔ اور ہم کو اس میں بلا کر سب ہم سے ملے۔ محفل مشاعرہ منعقد کی گئی دعوتیں ہوئیں۔ اور آخر چار پانچ روز کے قیام کے بعد ہم تھانہ بھون سے لکھنؤ روانہ ہو گئے

ہمارے آنے کی خبر سہارنپور تک پہنچ چکی تھی۔ اور سہارنپور کے لوگوں کو ہمارا پروگرام معلوم ہو گیا تھا۔ لہذا اب سہارنپور کے اسٹیشن پر ایک حملہ ہوا۔ دس بارہ شاعر قسم کے اہل وطن نے ہم کو گھیر لیا۔ کہ ایک دن سہارنپور میں بھی رہنا پڑے گا مگر ہم اپنی مجبوریوں کے اظہار کے بعد آزاد کر دیئے گئے۔ البتہ اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ان حضرات کی مدد سے سہارنپور سے لکھنؤ تک نہایت آرام دہ سفر کا انتظام ہو گیا۔ اور تمام راستہ اس طرح گزرا گویا ہم نے ایک ڈبہ اپنے اس مختصر خاندان کے لیے مخصوص کرا لیا تھا۔

سادھو

وطن جانے کو تو چلے گئے اور بخیریت تمام واپس بھی آ گئے۔ مگر معلوم ہوا کہ والد صاحب نے اپنے بال بچوں کو وطن نہ لے جانے کی جس دانشمندی سے ہمیشہ کام لیا تھا وہ کیا تھی۔ ہماری بیوی کو جب تھانہ بھون کے اعزہ میں گشت کرایا گیا تو ان کو عجیب عجیب باتیں سننا پڑیں۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا کہ یہ "سادھو" کہاں سے آ گیا ہے۔ یعنی وہ ساری باندھے ہوئے تھیں۔ اور سوائے بندوں اور چوڑیوں کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ اور تھانہ بھون میں اس وقت تک عورت کو عورت کا درجہ حاصل ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ سر سے پیر تک زیور میں لدی ہوئی نہ ہو۔ کسی نے کہا میم صاحب ہیں۔ کسی نے شفقت برتی تو بیدردی سے کہہ دیا۔ دلہن ننگی ہی چلی آئیں۔ ننگی سے مطلب کپڑوں کے بغیر چلے آنے سے نہ تھا۔ بلکہ تھانہ بھون میں عورت کی ستر پوشی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی۔ جب تک اس کے کپڑے اس کے زیور

سے نہ چھپ جائیں۔ ہماری بیوی کے پاس اول تو اتنے زیور ہی نہ تھے اور اگر ہوتے تو بھی وہ اس طرح زیورات کی چلتی پھرتی دکان بن کر ہرگز نہ جاتی۔ ہم تو نہایت بے تکلفی سے اپنے گھر گئے تھے۔ زیورات کی کسی نمائش میں نہیں گئے تھے دل دکھانے اور دل دیکھنے کی تمنا تھی۔ کڑے، چھڑے اور پازیب کی جھنکاریں سنانے نہ گئے تھے۔ نہ سننے کا اشتیاق تھا۔ والد صاحب بھی غالباً یہ چاہتے ہونگے کہ بیوی کو پہلے سر سے پیر تک لادلیں۔ تھانہ بھون پہنچ کر بیوی کو سونے چاندی کے دریا بہانے کے قابل بنادیں۔ اس وقت وطن لے جائیں تاکہ وہاں بھی لوگوں کو معلوم ہو کہ محل والی بہو آئی ہے۔ جب بیوی نے ہم کو اہلِ وطن کے یہ ریمارک سنائے تو ہم مسکرا کر رہ گئے اور ہم نے ان سے کہا کہ والد صاحب کی اس مصلحت کے آخر کچھ تو معنی تھے۔ اور ہم نے ان سے کہا کہ والد صاحب کے کبھی سسرال نہ جانے کا کوئی مفہوم تو ہونا ہی چاہئے تھا۔

گہرستان

میری نظموں اور غزلوں کا مجموعہ گہرستان کے نام سے عرصہ سے زیر ترتیب تھا اور میں اس کو خود چھپانا چاہتا تھا۔ برادر محترم مولوی محمد عثمان صاحب [illegible] اس طباعت کے لئے تمام انتظامات اس طرح کر دیئے تھے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ جیب خاص ہم کو صرفہ کرنا بھی نہیں پڑا اور کتاب بھی خوب ہم نے چھاپ لی۔ اس مجموعہ کا مقدمہ برادرِ محترم خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر۔ ایم بی ای وزیر ریاست کشمیر نے لکھا اور ہم نے

اس کو خان بہادر نواب بہادر ڈاکٹر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے سی آئی ای کے نام معنون کر دیا۔ نواب بہادر صاحب نے لکھا کہ آپ اس مجموعہ کو لے کر خود علی گڑھ آ جائیے۔ چنانچہ کتاب کے پریس سے آتے ہی ہم اسے لیکر نواب بہادر صاحب کے مزمل پیلس علی گڑھ حاضر ہوئے۔ اس موقع پر نواب صاحب بہادر نے ہماری نہ صرف بہت زیادہ آؤ بھگت کی بلکہ ہمارے اعزاز میں اپنے یہاں اپنے احباب کو ایک پارٹی دے کر ہمارا سب سے تعارف کرایا۔ اور ایک چھوٹی سی تقریر میں فرمایا کہ میں شوکت تھانوی سے بحیثیت ایک مزاح نگار کے واقف تھا، مگر بحیثیت شاعر کے آج ان سے ملا ہوں تو اس موقع پر خود غرض بننا نہیں چاہتا ہوں کہ ان کی شاعرانہ صلاحیت سے میرے تمام دوست جن کو میں یہاں یکجا کر سکا ہوں۔ لطف اندوز ہوں۔ اس کے بعد دیر تک ہم نظمیں اور غزلیں سناتے رہے نواب بہادر صاحب نے اپنے اثر سے اور خود اپنے احباب کے اثر سے نہ صرف ہماری کتابوں کے کافی خریدار دلوائے۔ بلکہ ہم کو بہت اصرار کے ساتھ واپسی کے وقت کچھ تحائف اور کچھ زر نقد بھی مرحمت فرمایا جس کو قبول کرنا ہم نے اس لئے باعث شرم نہ سمجھا کہ اول تو نواب بہادر صاحب واقعی بزرگانہ شفقت کے ساتھ پیش آئے تھے۔ دوسرے ہمارا ارادہ تھا کہ ہم خود اپنا بک ڈپو قائم کریں گے لہذا اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت بھی تھی۔ نواب بہادر صاحب سے اس ملاقات کے بعد بھی جس کسی کی ہم نے کوئی سفارش کر دی یا جس ادارہ کو نواب بہادر صاحب سے کچھ دلوانا چاہا کبھی اس سلسلہ میں ہم کو مایوس نہیں کیا گیا۔ اور خود ہم کو نواب بہادر صاحب نے مختلف مواقع پر جو امداد پہنچائی ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

سر محمد ظفر اللہ خاں

گہرستان کی ایک مجلد برادرِ محترم مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے آنریبل چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں کو بھی بھیجی تھی۔ چودھری صاحب نے اس کتاب کو گول میز کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اور اس پر عجیب حالات میں تذکرہ لکھ کر بھیجا۔ جو رسالہ نیرنگِ خیال لاہور میں چھپ چکا ہے۔ یوں تو گہرستان پر علامہ سر محمد اقبال۔ سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ۔ سر محمد مزمل خاں۔ سر سید لیاقت علی وغیرہ بہت سے بزرگوں نے تذکرہ کیا تھا۔ مگر سر محمد ظفر اللہ کا یہ تبصرہ رسمی اور زبانی قسم کا نہ تھا۔ سر ظفر اللہ نے فرمایا کہ یہ کتاب ایک سوٹ کیس میں رکھی ہوئی تھی اور وہ سوٹ کیس اسی سفر میں ایک جگہ سمندر میں جا گرا۔ بمشکل تمام اس کو نکالا گیا اور گہرستان کو بھی بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اسی تبصرہ میں ایک جگہ سر ظفر اللہ خاں نے عجیب بات فرمائی ہے۔

> "میں تو شوکت صاحب کی دلی کیفیات کا اندازہ کر کے خوش ہو رہا ہوں اور لطف اندوز بھی اور ساتھ ہی ساتھ مجھے یقین بھی ہے کہ شوکت صاحب کو یہ احساس ہوگا کہ میں ان کے تخیل کی پرواز اور فکر کی گہرائیوں سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ صاحبِ کلام ایک کیفیت کا اظہار ایک خاص ترکیب

> الفاظ سے کرنا چاہتا ہے۔ پڑھنے والے اور سننے والے اپنے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ میں اگر شوکت صاحب فکر و تخیل کا مالک ہوتا تو میں بھی اپنی کیفیات قلبی کو مزین الفاظ اور مرصع ترکیبوں میں ادا کرسکتا۔"

اس اقتباس کے بعد ایک لطیفہ پیش کیا جاتا ہے۔ کہ بریلی کے ایک رئیس اکثر اس خاکسار سے کلام سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ اور اس خاکسار کا دم نکل جایا کرتا تھا۔ اس فرمائش پر۔ اس لئے کہ پھر شروع ہوتے تھے۔ ان کے وہ تبصرے جن کا ہمارے بیچارے شعر سے دور کا تعلق بھی نہ ہوتا تھا۔ کہنے لگے۔ میاں ٹھہرو دوسرا مصرعہ ابھی نہ پڑھنا۔ پتہ بھی ہے تم کو کیا کہہ دیا ہے۔ تم نے یہ کہا ہے۔ یہ کہا ہے اور یہ کہا ہے یعنی جو ہم نے نہیں کہا تھا۔ وہ سب یہ بزرگ فرما جاتے تھے۔ اور آخر میں کہتے تھے کہ اب تم ہی بتاؤ کہ اس کے بعد دوسرے مصرع کی کیا ضرورت رہ سکتی ہے پہلا ہی مکمل شعر ہے۔ اور دوسرا مصرعہ محض بھرتی کا ہوگا۔ جب دوسرا مصرعہ سنا تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ آنکھیں بند کرکے کچھ غور فرمایا۔ اور ایک دم چونک کر بولے۔ نہیں صاحب دوسرے مصرعے نے حالات ہی بدل دیئے۔ اب اس شعر کا مفہوم یہ ہوا یہ ہوا اور یہ ہوا۔ یعنی جو کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ بیان فرما گئے۔ سر محمد ظفر اللہ خاں نے اس تبصرے میں کسی ایک موقع پر بھی ہمارے کسی شعر کو کسی ایک رنگ میں پیش نہیں کیا ہے۔ جو ہمارے

مفہوم سے علیحدہ ہو۔ مگر بات یہ بالکل سچی کہی ہے کہ شاعر کچھ کہتا ہے اور سمجھنے والے اس کو اپنے اپنے رنگ میں سمجھا کرتے ہیں۔ ہماری ایک نانی صاحبہ ہیں آپ پڑھی لکھی تو خیر نہیں ہیں۔ مگر سخن شناس بہت ہیں۔ ہمسائے شعر سننے کا بڑا شوق ہے اور ہر شعر سن کر یہی ایک بات ہمیشہ کہتی ہیں کہ "چاہے اس شعر کو ادھر سے لے جاؤ، چاہے ادھر سے لے جاؤ۔" مطلب ہوتا ہے "ادھر ادھر" کا حقیقت اور مجاز مگر یہ باتیں تو وہ جانتی نہیں۔ البتہ ادھر ادھر سے مفہوم پورا کر دیتی ہیں۔ سر محمد ظفر اللہ کے اس بیان کی تصدیق دیوانِ غالب کی مختلف شرحیں دیکھ کر کیجیے۔ کاش غالب خود زندہ ہوتے اور اپنا مفہوم خود بھی بیان کر سکتے۔

طوفانِ تبسم

اپنا ایک ڈپو قائم کرنے کا مستقل خیال تھا۔ اب تک ہماری تین کتابیں نکل چکی تھیں۔ "موجِ تبسم" نسیم انہونوی صاحب نے چھاپی تھیں "سیلابِ تبسم" صدیق بکڈپو نے لہذا چوتھا مجموعہ "طوفانِ تبسم" اور "گہرستان" ہم نے خود چھاپے طوفانِ تبسم کے لیے بھی برادرِ محترم مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے سرمایہ کا انتظام ایک ایسے بزرگ کے یہاں سے کرا دیا جن کی پہلی شرط یہی تھی کہ اس کے نام کو اچھالا نہ جائے۔ مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے ہماری تعمیری زندگی میں بہت کچھ ہاتھ بٹانا چاہا۔ اور بہت کوشش کی کہ ہم کسی طرح اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ مگر وہ بیچارے کیا کرتے غ

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

چنانچہ گہرستان اور طوفانِ تبسم کی اشاعت کے بعد اگر ہم ادبیت سے کام لیتے تو ایک چھوٹا سا بک ڈپو اپنا ذاتی ہو سکتا تھا۔ اور اب تک جو پچیس تیس کتابیں دوسرے ناشروں نے چھاپی ہیں۔ وہ ہم خود چھاپتے اور بچوں کے لیے کوئی مستقل سامان کر دیتے۔ مگر یہاں تو مقولہ یہ تھا کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو، شرافت اسی دن تک ساتھ دیتی تھی۔ جب تک روپیہ ساتھ چھوڑے رہتا تھا اور جہاں جیب میں کچھ آیا۔ بس یہ فکر رہتی تھی کہ کسی طرح یہ صرف ہو جائے۔ کوئی چرا لے، کوئی مانگ لے، مختصر یہ کہ ہمارے پاس سے جائے۔ آج کل پھر ذرا کم بختی کا دور ہو رہا تھا۔ اور شامتیں دُور دور سے گھیرنے چلی آ رہی تھیں۔

پھر وہی تاش اور وہی ہم

کوئی نہ کوئی کاروبار ہونا چاہیئے تھا۔ یا یوں کہیئے کہ کاروبار وہ کرے جو بیکار ہو۔ ہم خدانخواستہ بیکار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو وغیرہ کھولتے پھرتے۔ مقصد تو روپیہ لگانے سے اور منافع کمانے سے تھا۔ لہٰذا ہم نے سب سے زیادہ چلتا ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا اس کاروبار میں نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یا تو وارے نیارے ورنہ ہارے تو بھاگے نانیارے۔ یہ کیا کہ افیونیوں کی طرح بیٹھے انتظار کر رہے ہیں کہ کب ڈاکیہ آ کر قسمت کا فیصلہ سناتا ہے۔ کہ تمہارے اتنے وی۔ پی۔ وصول ہوئے اور اتنے واپس آئے۔ اس لغویت میں مبتلا ہونے کی بجائے ہم نے پھر تاش کھیلنا شروع کر دیئے اور جو تھوڑا بہت سرمایہ تھا وہ اس کاروبار میں لگا دیا۔ دیکھیے کاروبار خواہ کوئی بھی ہو اس کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ نفع یا نقصان، بڑی بڑی سرمایہ دار

کمپنیاں بغیر تاش کھیلے فیل ہو جایا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے ملک التجار اپنا دیوالہ نکلوا دیتے ہیں، اور اگر نفع ہونے والا ہوتا ہے تو مٹی اٹھا لیجیے سونا بن جائے چنانچہ ہم تو اس سلسلہ میں تدبیر سے زیادہ تقدیر کے قائل تھے۔ اور تقدیر کی آزمائش کا موقعہ جس قدر تاشوں میں حاصل ہوتا ہے اتنا کسی اور کاروبار میں حاصل نہیں ہو سکتا

تاش کھیلنے کے سلسلہ میں ہماری اس تجدید کا جشن احباب نے منایا۔ لوگ یکجا ہوئے نئے نئے چکنے چکنے تاش منگائے گئے۔ اور ہم پھر اسی شغلہ میں ڈوب کر رہ گئے کاروبار میں تو نفع اور نقصان کا چولی دامن کا ساتھ ہے کبھی اپنی چاندی ہو جاتی تھی اور کبھی کسی معاملہ میں خسارہ، دراصل تجارتی دنیا اسی جوا رکھائی پر قائم ہے اور تاشوں کے سلسلہ میں تو نہایت مشاق قسم کے کاروباری آدمی کی ضرورت ہوتی ہے، جو نہ ہارا نہ پیچھے نہ کھسکا۔ بس استقلال کے ساتھ ان تھپیڑوں سے کھیلتا رہے۔ ڈوبتا ہے۔ ابھرتا ہے۔ جو ڈوبے گا وہی موتی نکالے گا۔ اور جو ابھرنے کے بعد پھر ڈوبنے سے ڈرا یہ سمجھ لیجیے کہ پھر وہ ڈوبا ہمیشہ کے لیے روپیہ پیسہ کیا ہے۔ ہاتھ کا میل۔ دولت یعنی دولاتوں والی چلتی پھرتی چیز۔ ان چیزوں کا کیا بھروسہ، قارون نے جمع کیا تھا تو کیا پایا۔ حاتم نے صرف کیا تھا۔ آج تک نام ہے۔ اصلی چیز تو دل ہے۔ بس دل بڑا ہونا چاہیے انسان کا۔ انشاء اللہ زندگی بھر فاتحے کرے گا۔ خصوصاً ایک تاش کھیلنے والے کا دل تو اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ اس پر گرم و سرد دونوں کا اثر نہ ہو۔ اگر جیتنے سے زیادہ خوش ہو گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہارنے کی تاب لا ہی نہ سکے گا اور ہار کر اگر بہت بد دل ہو گیا۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ ہار سے ڈر کر رہ جائے گا

گا۔ اور بازی لگانے کے لئے جس جسارت کی ضرورت ہے۔ وہ اس غریب میں کبھی پیدا نہ ہو سکے گی۔ دراصل تاش کے تمام لطف کا راز خطرہ ہے جو بازی لگا کر کھلاڑی حاصل کرتا ہے۔ اس خطرے میں پڑ کر ناکامی سے ڈرنا ہی نہ چاہئے۔ اس لئے کہ ناکامی اس خطرے سے زیادہ خطرناک تو ہو ہی نہیں سکتی لیکن اگر کامیابی ہو گئی تو انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے وہ کام کیا ہے جو رستم سے نہ ہو گا۔ پھر یہ کہ اسی تاش کی بدولت انسان کو زندگی کے وہ قیمتی تجربے حاصل ہوتے ہیں جو کسی اور صورت سے کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔ کسی دوست کو پرکھنا ہو ساتھ میں تاش کھیلا کر داؤ لگا کر پرکھ لیجئے۔ اپنے چہرے سے نقاب ہٹا کر اصلی خدوخال میں آپ کے سامنے آ جائے گا۔ بڑے بڑے یارانِ وفا طوطے کی طرح وقت پڑ جانے پر آنکھ بدل لیا کرتے ہیں۔ مگر خدا نہ کرے کہ آپ پر وقت پڑے بغیر وقت پڑے ہی اگر تجربہ کرنا ہے۔ تو کسی دوست سے تاش کھیل کر دیکھ لیجئے، خواہ کتنا مکمل انسان کیوں نہ ہو۔ ایسا لاجواب طوطا ثابت ہو گا۔ کہ آپ خود بھی جی جی بولنے لگیں۔ اس سلسلہ کے بے شمار تجربات میں سے صرف ایک یہاں بیان کرنے کو دل چاہتا ہے۔ تاکہ ہم کو بھی کوئی ناتجربہ کار نہ کہہ سکے۔ رفیع احمد خاں صاحب کے اور ہمارے ایک مشترک دوست جن کی ہمہ گیر قابلیت سے ہم سب ہی نالاں تھے۔ اور جن کو ہم واقعی دوست جانتے تھے۔ بلکہ جو اب تک ہمارے دوست ہر وقت کے ہمنشیں اور ہر دکھ درد کے شریک ہیں۔ ایک رات کھیل میں شریک ہوئے۔ صبح ہم کو دہلی روانہ ہونا تھا۔ اس لئے کہ دوسرے دن دہلی سے براڈکاسٹ کرنا تھا۔ اس رات حالات اس قدر ابتر ہوئے کہ ہم فالتو روپے کے علاوہ دہلی

کا کرایہ تک ہار گئے۔ اور ہمارے یہ دوست جیتے۔ کھیل کے اختتام پر ہم نے رفیع احمد خاں کے سامنے ان عزیز دوست سے عرض کیا آپ مجھ کو اس جیتے ہوئے روپے میں سے اتنا روپیہ قرض کے طور پر دے دیجئے۔ میں دہلی سے آتے ہی ادا کر دوں گا۔ معلوم یہ ہوا کہ گویا آپ سے کبھی کی جان پہچان ہی نہیں ہے صاف انکار کر دیا۔ رفیع احمد خاں کو ان کے اس انکار پر ان سے زیادہ غصہ ہم پر آ رہا تھا کہ ہم نے آخر ان سے روپیہ کیوں مانگا۔ رفیع احمد خاں کے متعلق ہم کو معلوم تھا کہ یہ بھی ہارے ہیں۔ لہذا ان سے طلب کرنے کا سوال ہی نہ تھا آخر ہم کو اسی وقت گھر جانا پڑا۔ حالانکہ گھر پر سب کو یہ معلوم تھا کہ ہم رات ہی کی کسی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گئے ہیں۔ اور واقعی یہ رات ہم نے تاش کھیلنے کے لئے چرالی تھی۔ گھر جا کر بٹوہ نکل جانے کا ایک افسانہ سب کو سنایا۔ اپنی رات بھر کی پریشانی کا ذکر کیا۔ اور روپیہ لے کر پھر دہلی روانہ ہو سکے۔ ہمارے یہ دوست آج بھی ہمارے بیحد غمگسار ہیں۔ جہاں ہمارا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہا دیں گے مگر جو کچھ ہوا تھا وہ ہم لکھ ہی چکے ہیں۔ ہم نے اپنے ان دوست سے پھر کبھی اس بات کی شکایت نہیں کی۔ مگر ہمارے دل پر اس قدر گہری نقش ہو چکی ہے کہ اگر ہم خود اس کو بھلانا چاہیں تو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

تاشوں کی دق

تاشوں کی دق۔ دق کی بے شمار قسموں میں سے ایک تندرست قسم کی دق ہے جس کے جراثیم پھیپھڑوں میں زخم نہیں ڈالتے بلکہ پرس اور جیب کو چھلنی

کر دیتے ہیں۔ ہم اس دق کے تیسرے نہیں بلکہ شاید بیسویں پچیسویں درجے میں مبتلا تھے۔ اور ہمارے صحت یاب ہونے کی اب کوئی امید نہ تھی معلوم نہیں کس کس کے مقروض تھے۔ گھر سے کیا کیا بہانے کر کے روپیہ لاتے تھے اور سب ان ہی تاشوں کی نذر کر دیتے تھے۔ دنیا کا کوئی اور شوق تھا ہی نہیں مرض اس لئے بڑھ رہا تھا کہ بیوی سے چوری تھی۔ اگر کھلم کھلا کھیلتے ہوتے تو شاید اتنی چوریاں کرنا نہ پڑتیں اور نہ گھر سے اس قدر غائب رہتے۔ ہم خود جانتے تھے کہ ہماری زندگی میں یہ گھن لگ چکا ہے۔ ہم کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہم اس علت میں مبتلا نہ ہوتے تو ہمارے لئے ترقی کے امکانات موجود تھے اور اب بھی اگر تائب ہو جائیں تو ترقیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں مگر سنجیدگی سے بار بار کوشش کرنے کے باوجود پھر اپنے کو اسی بلا میں گرفتار پاتے تھے۔ اور اس کا کوئی علاج اب تک ہماری میں نہیں آرہا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کا کوئی ناگوار اثر دماغ پر نہیں پڑ رہا تھا۔ اور ہم بے حیائی کی عمر دراز اسی طرح بشاش اور خوش تھے۔

مرزا عالمگیر قدر

آپ بھی رفیع احمد خاں صاحب کے تاشوں کی گڈی سے برآمد ہوئے تھے۔ ابھی مکمل ملاقات بھی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ نہایت شفقت سے عزیزم اور صاحبزادے وغیرہ کہہ کہہ کر اپنی بزرگی کا سکہ ہم پر بٹھا دیا اور پھر شروع کر دی۔ وہی بزرگانہ ڈانٹ ڈپٹ۔ پند و نصیحت۔ ہر شخص کے ہر معاملہ میں دخل۔ ہر بات میں آپ کی طرف سے ایک قول فیصل۔ ہر مبحث پر معلومات کا ایک دریا بہا دیتے ہیں۔ شعر سنائیے تو شعر

آپ کا ہوگا۔ اور مفہوم وہ بیان فرمائیں گے۔ لباس پہنئے۔ تو اس کے تانے بانے سے لے کر خیاط کی سوئی تک پر ایک مکمل تبصرہ فرما جائیں گے۔ بیمار پڑیئے تو ڈاکٹر نسخہ لکھے گا۔ علاج آپ کریں گے۔ کسی کے یہاں ولادت ہو تو دائی کو طلب کر کے ضروری مشورے آپ دیں گے۔ حالانکہ سوائے اس کے کہ آپ خود تو پیدا ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی اور کوئی معلومات آپ کو نہیں ہے۔ کسی کو چھینک آئی اور آپ نے اس کے مستقبل پر ایک دھواں دھار تقریر فرما دی کہ اب اس کو رات کے بھیگتے بھیگتے ٹمپریچر ہو جائے گا۔ صبح تک اختناق الرحم کے دورے پڑنے لگیں گے۔ پھر انسائیکلوپیڈیا ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے سناٹوجن کے انجکشن نہ لئے تو کل شام تک اسی وقت اس کے پسینہ سے شکر آنے لگے گی۔ اور دماغ میں نیلیا پیدا ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دراصل اس کو کانسٹینٹی نوبل کی شکایت ہے میاں۔ اس کا علاج جم کر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے پیروں میں ملیریا کی شکایت پیدا ہو جائے۔ اسی مرض میں سیکڑوں آدمیوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے کچھ پتہ نہیں چلا کہ لارڈ کچنر مر کے ڈوبے یا ڈوب کے مرے۔ رفیع احمد خاں اور ہم سب حیرت سے ان کا منہ دیکھتے تھے۔ اور وہ اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ اس طبی عقدے کو سلجھاتے اور ہم سب کو اپنی قابلیت سے الجھاتے چلے جاتے تھے۔ ہر فن میں مہارت کا یہ عالم کہ کوئی ماہر موسیقی آ گیا۔ اب آپ اس کے سر ہیں کہ استاد یہ گندھار میں جو بھیروین کی تان آجاتی ہے۔ اسے اگر مالکوس کے سروں میں لایا جائے تو میاں کی ٹوڈی کا اس میں آخر کیا نقصان ہے۔ یا فرض کیجئے کہ ترانے میں آدھا سرگم ملہار کے طریقے پر ہو۔ اور آدھا بلمپت اور درت دونوں کے حاصل ضرب سے

اڑانے کے طرز پر رکھا جائے تو کیا ٹھکانہ ہوگا۔ ماہر موسیقی اپنا ساز اٹھا کر اپنے سر پر اپنے پیر رکھتا۔ اور بھاگتا وہاں سے۔ اب آیا کوئی شاعر اور شامتِ اعمال سنا دیا اس نے اپنا کلام۔ بس پہلا ہی مصرعہ سن کر ایک دم اچھل پڑے "میاں ٹھہرو کس قدر نازک بات کہہ دی ہے تم نے اب اس پر دوسرا مصرعہ لگاؤ گے تو پتہ چلے گا کہ کیسے لوہے کے چنے چبانا پڑتے ہیں ذرا پھر پڑھو اس مصرعہ کو ؏

رات گذری نور کا تڑکا ہوا

کیا بات کہہ دی ہے رات گزر ہی نہیں سکتی جب تک نور کا تڑکا نہ ہو اور نور کا تڑکا ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ رات گذر نہ جائے۔ پھر نور کا تڑکا کہا ہے اگر کہیں تڑکے کا نور کہہ دیتے تو مصرعہ پھسپھسا ہو کر رہ جاتا۔ مختلف پہلو نکالے ہیں اس مصرعہ میں اور پھر ردیف "ہوا" اس قدر استحکام اور انتظام کے ساتھ رکھ دی ہے۔ کہ ہلائے نہ ہلے۔ پھر قیامت یہ رکھی ہے کہ ترتیب کس قدر پاکیزہ ہے اگر اسی مصرعہ کو یوں کہتے کہ ؏

نور کا تڑکا ہوا اور گذری رات

تو واقعہ کے اعتبار سے مصرعہ مہمل ہو جاتا۔ اس لئے کہ پہلے رات گذرتی ہے بعد میں نور کا تڑکا ہوتا ہے۔ لہذا ظالم نے یوں نہیں کہا ہے۔ بلکہ پہلے رات گذاری ہے کہ "رات گذری" پھر نور کا تڑکا پیدا کیا ہے کہ "نور کا تڑکا ہوا" کس قدر برابر کے دونوں ٹکڑے ہیں۔ اور کیسے دست و گریباں۔ کوئی لفظ بیچ سے ہٹا دیجئے مصرعہ ناموزوں ہو جائے گا۔ کوئی لفظ اور جوڑ دیجئے۔ تقطیع بدل جائے گی یہ کہلاتا ہے التزام۔ انتظام، اور اب دوسرے مصرعہ میں جو کچھ ہوگا۔ اس کا نام ہے انعام

شاعر نے بیاض اٹھائی جوتے چھوڑے اور وہ بھی بھاگا اپنی ناک کی سیدھ میں کہ شامت مارا کوئی آم والا آگیا اور آپ بیٹھ گئے اس کے ٹوکرے کے پاس عینک لگا کر اور شروع کر دیا۔ آموں پر تبصرہ کیوں بھئی یہ دسہری کی شکل کا کونسا آم ہے، ہے تو یہ دسہری ضرور مگر اس کی قلم میں کچھ تشنہ نالو کا میل ہے۔ اور اس کے پیڑ کے ارد گرد کہیں یا تو کٹھل کا درخت تھا ورنہ مالی نے قلم لگاتے وقت ارہر کی دال ضرور کھائی تھی۔ اس کی خوشبو میں جو ایک قسم کی لہسنیت ہے وہ بغیر اس کے پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور تم کو معلوم نہیں ہے۔ کہ دسہری تمام آموں میں سب سے زیادہ نازک آم ہوتا ہے اس کو لو جلد لگتی ہے۔ اس کو تم لوگ بہت معمولی بات سمجھتے ہو۔ حالانکہ اس کو اس سے بخار ہو جاتا ہے۔ اور خدا پناہ میں رکھے۔ آم کے سرسام سے نہایت سخت قسم کا ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہے کس حساب سے پانچ روپے ڈھیر کی تو خیر کوئی بات نہیں، بلکہ اس دسہری کو دیکھو یہ جو تمہارے سامنے کچھ مضمحل سا پڑا ہے۔ اس میں یقیناً شاہ بلوط کی آمیزش ہے۔ وزن بھی اس کا دسہری کے عام وزن سے کچھ کم معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ جو اس کی کروٹ میں ایک جھری پڑی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس طرف کے تمام شیرینی کے ریشے پھٹ کر ذائقہ کو منتشر کر چکے ہوں گے۔ خوشبو بھی نقلی سی معلوم ہوتی ہے یہ نہیں کبھی نہیں۔ یہ تو ڈھائی روپے سے زیادہ کی چیز نہیں۔ حالانکہ اگر وہ دام نہ لگاتے تو شاید وہ مفت ہی میں تمام آم یہیں الٹ کر چلا جاتا۔

ان حضرت سے واسطہ پڑا تھا۔ اور آپ نے والد صاحب مرحوم کے متعلق ایک ادھوری روایت بیان کر کے یہ ثابت کر دیا تھا۔ کہ آپ ہمارے چچا ہیں لہذا

ہم آپ کو نہایت ادب سے چچا کہا کرتے تھے۔ اور آپ شفقت سے زیادہ ہر وقت سرزنش میں مصروف رہتے تھے۔ آخر اس طریقے سے تنگ آکر ہم نے ایک دن تمام احباب کے مجمع میں کہا کہ حضرات یا تو میں خودکشی کی اجازت چاہتا ہوں۔ ورنہ ان حضرت کی سختی سے میری جان بچائیے۔ خواہ مخواہ کے یہ چچا بنے ہوئے ہیں حالانکہ ان سے کہیں بہتر چچا بننے کی صلاحیت خود مجھ میں ہے اور اگر مجھ کو ان کا چچا بننے کا موقع آپ حضرات دیں تو میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھا سکوں گا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ہر سال ایک عام انتخاب ہوا کرے۔ اور اس میں ہم دونوں میں سے جو زیادہ ووٹ حاصل کرے۔ وہی اس سال کے لیے چچا بنا کرے۔ ہمارے اس بیان لوگوں کی توجہ اس طرف ہوئی کہ واقعی اس قسم کا موقع ان کو بھی ملنا چاہیے۔ کیا تعجب ہے کہ یہ عالمگیر سے بہتر قسم کے چچا ثابت ہوں چنانچہ اسی وقت تمام احباب کو جمع کیا گیا جو موجود تھے۔ اول تو وہی کافی تھے کورم پورا تھا۔ مگر معاملہ چونکہ نازک تھا۔ لہذا پورے ہاؤس کے سامنے پیش ہوا اور دوسرے دن انتخاب کا وقت مقرر کر دیا گیا۔ تاکہ ہم دونوں اس عرصہ میں اپنے اپنے لئے کنویسنگ کریں۔ دوسرے دن عجیب عالم تھا۔ کبھی عالمگیر کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ کبھی ہمارے ووٹ ٹوٹ کر ادھر ہو جاتے تھے۔ کبھی ان کے ووٹ ٹوٹ کر ہماری طرف آجاتے تھے۔ آخر رائے شماری کا وقت آیا رفیع احمد خاں پولنگ آفیسر مقرر ہوئے اور باقاعدہ ووٹ پڑنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں پولنگ آفیسر نے نتیجہ سنا دیا۔ ہم کو تیرہ میں سے نو ووٹ ملے تھے عالمگیر کو تین اور ایک ووٹ مشکوک ہو کر مسترد کر دیا گیا۔ عالمگیر نے اعلان

سنتے ہی چچا کہہ کر ہم کو آداب کیا۔ اور ہم نے شفقت کے ساتھ اُن کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ لوگوں نے ہم کو مبارک باد دی اور ہم نے شکر گذار ہو کر کہا کہ دعا کیجیے کہ میں صحیح معنوں میں چچا ثابت ہو کر اس کی کچھ اصلاح کر سکوں

اے۔ آئی۔ سی۔ سی۔ کلب لکھنؤ

رفیع احمد خاں صاحب کوآپریٹو سوسائٹیز کے دفتر میں ہیڈ اسسٹنٹ تھے۔ اور دفتر کے بعد وہیں دفتر کے پختہ کورٹ میں ٹینس کھیلا کرتے تھے ٹینس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں ایک کلب کی بنیاد پڑی جس کا نام انگریزی میں اے آئی۔ سی۔ سی کلب رکھا گیا۔ اس کا واضح کرنا تو خیر ہمارے امکان میں نہیں ہے۔ البتہ نام کا ترجمہ یہ ہوا۔ آل انڈیا کوآپریٹو انجمن حماقت مآب لکھنؤ اس کلب کے صدر مدتوں سے محمد احمد صاحب چلے آرہے تھے اور طے یہ تھا کہ جس دن کوئی اور صاحب ان سے بڑھ کر اس منصب کے لئے اپنے استحقاق کا ثبوت دینا شروع کریں گے۔ اسی دن کلب کے ممبروں کی تائید حاصل کر کے اس عہدہ پر آجائیں گے۔ چنانچہ خدا لگے بانی تو سب کو بچایا مگر حکیم محمد نذیر صاحب آخر کار اتفاق رائے سے صدر ہو گئے۔ اس کلب کی ممبری کے لئے یہ ضروری تھا کہ ممبر یوں چاہے جیسا بھی تیز طرار ہو۔ ذہین اور طباع ہو۔ مگر اس میں شے لطیف کی کسی نہ کسی حیثیت سے کمی ضرور ہو۔ چنانچہ اس کلب میں ہمارے داخلہ کا قصہ یہ ہوا کہ ہم شام کے وقت بغیر روشنی کے بائیسکل پر جا رہے تھے کہ راستہ میں ٹریفک پولیس کے ایک کانسٹبل نے روک لیا اور ہم سے

بائیسکل رکھوالی اور کہا کہ آپ کسی شخص کو لائیں جو شناخت کر کے یہ بتا دے کہ آپ نے نام اور پتہ صحیح لکھوایا ہے۔ ہم فوراً خان صاحب کے دفتر پہونچے اس لیے کہ ٹینس ختم کر کے یہ حضرات کچھ دیر غپ شپ کیا کرتے تھے۔ اور ان سے اس حادثہ کا ذکر کیا۔ سب کے سب فوراً ہمارے ساتھ وہاں تک گئے مگر وہاں نہ بائیسکل تھی نہ کانسٹبل۔ ہم سے پوچھا کانسٹبل ڈیوٹی پر تھا یا گشت کر رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم کو پتہ نہیں البتہ اس نے ہم کو یہیں روک کر نام اور پتہ لکھا تھا۔ بلکہ وہ تو وردی میں نہ تھا۔ اب تو یہ حضرات چونکے۔ کوتوالی جا کر تحقیقات کی۔ مگر وہاں بھی پتہ نہ چلا۔ مجبوراً رپورٹ لکھوا دی اور دوسرے دن ہم اس کلب کے متفقہ طور پر ممبر چن لیے گئے۔ بائیسکل پھر نہ مل سکی اور نہ اس کلب کی ممبری سے ہم علیحدہ ہو سکے۔ کلب کے باقی تمام ممبر بھی اسی قسم کے کسی نہ کسی واقعہ کے ماتحت ممبر بنے تھے۔ خود رفیع احمد خاں بھی ممبر تھے۔ اور خدا کے فضل سے ممبروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اور کلب ترقی پر تھا۔ کہ کسی دفتری مصلحت کی بنا پر خانصاحب کو وہاں ٹینس ترک کرنا پڑی اور اسی سلسلہ میں کلب بھی ختم ہو گیا۔ مگر اس کے ممبر اب تک موجود ہیں۔ اور ان کی خصوصیات اب تک زندہ ہیں۔

یوپی انڈسٹریل نمائش

اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک بہت بڑی نمائش کے انتظامات شروع ہوئے تمام وکٹوریہ پارک میں اس نمائش کے مختلف شعبے پھیلا دیئے گئے۔ ہندوستان بھر کے ماہرین فن اس موقع پر لکھنؤ میں یکجا ہو گئے۔ بڑے بڑے پہلوان اور پٹے

بڑے ماہرین موسیقی۔ بڑے بڑے مصور اور بڑے بڑے دستکار، اسی سلسلہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کرنے کے انتظامات بھی شروع ہوئے اور خان بہادر سید عین الدین صاحب، ایم. بی. ای، انسپکٹر جنرل رجسٹریشن، یو. پی کو اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ خان بہادر صاحب نے اپنے اسسٹنٹ چنے۔ ایک خاکسار اور دوسرے شبیر احمد صاحب علوی۔ ہم دونوں نے پورے صوبہ کا دورہ کیا۔ شعراء سے وعدے لیے۔ نواب صاحب چھتاری سے مشاعرے کی صدارت کی استدعا کی۔ اور کیپٹن نواب جمشید علی خاں صاحب آف باغپت کو صدر مجلس استقبالیہ بنایا۔ لکھنؤ میں ایسا ہنگامہ خیز مشاعرہ شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ تمام اطراف ملک کے نامی شعراء موجود تھے۔ اور بیس بائیس ہزار سامعین کا مجمع تھا۔ پہلی نشست میں حاضرین نے یہ مطالبہ کیا۔ کہ باقاعدہ مشاعرہ شروع ہونے سے قبل چند مخصوص شعراء کو پڑھوا دیا جائے۔ اس مطالبہ کو پورا کر دیا گیا۔ مگر اب مسلسل یہ تقاضہ تھا۔ کہ مشاعرہ ان ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اور جس جس کو وہ چاہیں پڑھوائیں نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعرہ میں کچھ ناگوار سی صورت پیدا ہو گئی۔ اور اس اجلاس کو چار بجے کے قریب ختم کر کے اعلان کر دیا گیا کہ دوسری نشست دوسرے دن بارہ بجے سے شروع ہو گی۔ یہ دوسری نشست اس قدر کامیاب تھی کہ آج بھی لوگ اس مشاعرہ کو یاد کرتے ہیں۔ مشاعرے کی اس کامیابی کے سلسلہ میں رائے صاحب برج بلبھ کشور نے دو طلائی تمغے ایک مجھے اور ایک شبیر احمد صاحب علوی کو دیئے اور نمائش کے دربار میں شبیر احمد صاحب کو سند اور مجھے طلائی تمغہ یو. پی گورنمنٹ کی طرف سے دیا گیا۔

ہندوستانی اکاڈمی

یو۔پی کی ہندوستانی ایکاڈمی نے بھی یہ طے کیا کہ اپنا جلسہ اسی نمائش میں رکھے۔ چنانچہ صوبہ کی اس مقتدر ادبی انجمن کے اس جلسہ میں ہم کو بھی ایک مزاحیہ مقالہ پڑھنے کے لیے ڈاکٹر تارا چند سکریٹری ہندوستانی ایکاڈمی نے مدعو کیا۔ ایکاڈمی کا یہ جلسہ مشاعرہ کے وسیع پنڈال میں ہوا۔ اتنا بڑا پنڈال اور ملک میں محدود قسم کا ذوقِ ادب، پھر یہ خیال غالباً یہ بھی ہوگا کہ یہ جلسہ محض ادبی نہیں بلکہ علمی بھی ہوگا۔ لہٰذا نمائش کے دوسرے تماشوں کو چھوڑ کر بھلا کون اس علم و ادب کی طرف متوجہ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنڈال کے ایک گوشہ میں دس پندرہ آدمی جلسہ کرنے بیٹھ گئے۔ مگر وہ دس پندرہ اس قدر بھاری بھرکم لوگ تھے کہ ان میں کا ہر شخص اپنے اقتدار اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے پچیس پچیس ہزار سے کم کا نہ تھا۔ مثلاً سر تیج بہادر سپرو، سر سید لیاقت علی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر تارا چند وغیرہ۔ اسی مختصر سے جلسہ میں گراں ادبی پہاڑوں کے سامنے اس ذرۂ بے مقدار نے بھی اپنا مقالہ پڑھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ہر فقرہ پر حوصلہ افزائی فرما رہے تھے۔ اور سر سپرو کے متعلق قطعاً یاد نہیں کہ وہ کیا کر رہے تھے مگر اس جلسہ میں بھی سر سید لیاقت علی وہی بھوپال والے چچا لیاقت علی بنے بیٹھے تھے۔ یعنی آنکھوں سے تحسین و آفرین کے بجائے شفقت برس رہی تھی۔

سگ بازی

آپ نے مرغ بازی اور بٹیر بازی وغیرہ سنا ہوگا۔ مگر ہم کو ان میں سے تو کسی سے شوق کبھی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ پتنگ بازی میں بھی ہمیشہ کورے رہے۔ مگر اب سگ بازی سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ لکھنؤ کی نمائش میں جہاں اور چیزیں تھیں وہاں گرے ہاؤنڈ ریس بھی تھی۔ اور کتوں کی یہ دوڑ بالکل گھوڑ دوڑ کے اصول پر ہوتی تھی۔ نمائش کے ساتھ اس کے تمام کھیل تماشے ختم ہوگئے۔ مگر کتوں کی دوڑ میں جاتے تھے بازیاں لگاتے تھے۔ اور اس شوق کے پیچھے تاش تک کو چھوڑ رکھا تھا۔ رفیع احمد خاں، عالمگیر، یوسف مرزا، اور نواب زادہ خلیل اللہ خاں گویا پورا لشکر ہوتا تھا ہمارے دوستوں کا۔ چنانچہ ہم بھی جانے لگے اور سب کے ساتھ بازیاں لگانے لگے۔ کبھی جیتے کبھی ہارے۔ مگر ایک مرتبہ تو کمال ہی ہوگیا۔ ایک کتے کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ بجلی کی طرح اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر یقینی طور پر ریس جیت لے گا۔ ہم سب نے اس کتے پہ داؤ لگا دیا۔ کتا واقعی برق بلا تھا۔ چھوٹتے ہی جو تیر کی طرح چلا ہے تو باقی کتے اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے تھوڑی دور تک تو وہ اسی طرح چلا آیا اس کے بعد ایک مرتبہ کھڑا ہوگیا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک مرتبہ دم ہلائی پھر آپ بھی بھونکے اور پھر نہ جانے کیا طے کرکے واپس لوٹ گئے۔ خیال تھا کہ دوسرے کتوں کو دور ہوا دیکھ کر شاید آپ پھر دوڑیں مگر آپ سیدھے اپنے جنگلے میں چلے گئے۔ اور ہم سب کا دیوالہ نکلوا دیا۔ کتوں کی اس دوڑ کے سب سے بڑے ماہر عالمگیر تھے جس طرح وہ ہر فن کے نہایت آسانی کے ساتھ ماہر ہو جایا کرتے ہیں۔ کتوں کے تمام حالات ان کی

ان کی نسلی کیفیت، ان کے اطوار اور ان کے امراض سب پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا جس وقت دکھائی کے لیے کتے سامنے لائے جاتے تھے آپ ان پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہی فوراً بتا دیا کرتے تھے۔ کہ اس کتے میں شرافت کا کتنا خون ہے اور اس کتے کی تعلیمی حالت کس قدر ہے گرے ہاؤنڈ ریسنگ کا پورا ریکارڈ آپ کے پاس محفوظ تھا ہر روز ریس کی کتاب لے کر آپ تمام پرانے ریکارڈ کی گویا پوری اسٹڈی فرماتے تھے اور پھر ایک باقاعدہ اسکیم لے کر ریس میں جایا کرتے تھے کہ اس میں اتنے ٹکٹ خود ضرور خریدیں گے اتنے ٹکٹوں میں دوسروں کے شریک ہوں گے۔ اور احباب کو یہ مشورہ دیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم سب سے زیادہ جیت میں وہی رہتے تھے۔ مگر ان کے مشوروں پر چلنا ہمارے امکان میں اس لیے نہ تھا کہ اصول کے ماتحت ممکن ہے کہ جیت تو جائیں مگر یہ احساس کہ ہم عالمگیر کے مشورے پر چلے ہیں مشکل سے پنپنے دے گا۔ اس سلسلہ میں ایک اور تاریخی واقعہ یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ہم ترپن روپے ہارے ہوئے تھے۔ اور آخری دن جب اس ریس کو سرکاری طور پر ختم کیا جا رہا تھا۔ بالکل آخری ریس میں ہم نے ایک ڈبل ٹوٹ کا ٹکٹ سب سے **الگ** ہو کر تنہا خریدا۔ اور وہی ٹکٹ جیتا اس میں ہم کو ترپن روپے ہی ملے۔ لکھنؤ سے یہ ریس کلکتہ چلی گئی ہم لوگ تو صبر کر کے بیٹھ گئے مگر عالمگیر کلکتہ تک تشریف لے گئے۔ آپ نے پالتو کتوں کو تو پیچھے پیچھے آتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ مگر کتے کے پیچھے کسی انسان کے جانے کی یہ پہلی مثال گویا آپ نے قائم کی۔

سودیشی ریل کتابی صورت میں

۱۹۳۰ء میں سودیشی ریل نامی جو مضمون لکھا تھا اس کی مانگ اب تک

بہت زیادہ تھی۔ حالانکہ وہ چھپن مرتبہ مختلف زبانوں کے مختلف رسالوں میں چھپ چکا تھا۔ مگر اب لوگوں نے مشورہ یہ دیا کہ اس کو علیحدہ کتابی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس کو از سر نو ذرا وسعت دے کر لکھا اور ہمارے نزدیک جو خامیاں اس میں رہ گئی تھیں۔ ان کو دور کر دیا۔ اس کے انگریزی ترجمہ کو بہت تلاش کیا۔ مگر کہیں نہ مل سکا۔ آخر رفیع احمد خاں نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ اور ہم نے اس ترجمہ کے ساتھ سودیشی ریل کو کتابی صورت میں پیش کر دیا ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن گورنمنٹ آف انڈیا نے اس پر مقدمہ لکھا۔ اور ہم نے ریل کی مناسبت سے موجودہ ریلوے ممبر گورنمنٹ آف انڈیا آنریبل چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں کے نام اس کو معنون کر دیا۔ ایک ہزار کا یہ ایڈیشن بھی ناکافی ثابت ہوا۔ اور اب بھی لوگ سودیشی ریل کی تلاش کرتے ہیں۔ اور ان کو اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ حد یہ ہے کہ خود ہمارے پاس اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

روزنامہ حق

لکھنؤ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا حق عبدالرؤف صاحب اور آپ کے برادر محترم علی اختر صاحب عباسی ہمارے لئے اجنبی نہ تھے۔ رفیع احمد خاں کے یہاں ان دونوں حضرات سے نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ اور بار بار ملنے کے بعد ایک قسم کی بے تکلفی سی تھی۔ عبدالرؤف صاحب نے یہ طے کیا کہ اپنے اخبار کو

روزنامہ بنادیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک دن ہم کو بھی یاد فرمایا۔ مقصد یہ تھا کہ ہم بھی ان کے مشوروں میں شریک ہوسکیں۔ اخبار کی پوری اسکیم سننے کے بعد ہم نے بھی کچھ مشورے دیئے۔ اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں ان سے وعدہ کرلیا کہ مزاحیہ کالم جس کا عنوان ہم نے خود حق کی رعایت سے "حق و باطل" تجویز کیا تھا۔ لکھ دیا کریں گے۔ مگر وہ خود اور علی اختر صاحب عباسی اس بات پر مصر تھے کہ ہم باقاعدہ ملازمت کی صورت میں حق کی اسسٹنٹ ایڈیٹری کی ذمہ داری لے لیں۔ ہم نے ان سے غور کرنے کے لئے وقت مانگا۔ اور پھر اپنے چند احباب سے مشورہ لیا۔ زیادہ تر لوگوں کی یہی رائے تھی کہ ملازمت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر ہم نے اپنے فیصلے سے ان کو مطلع نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے دن خود علی اختر صاحب کا خط آیا کہ فوراً آجاؤ اور اپنے اخبار میں کام شروع کردو۔ تنخواہ طے ہوچکی تھی۔ ہم حق کے دفتر پہنچ گئے۔ اور ملازمت قبول کرلی۔ خبروں کا ترجمہ حق و باطل کا لکھنا اور شذرات کا لکھنا وغیرہ ہمارے سپرد ہوا۔ اس کے علاوہ ہر روز ایک قطعہ شاعر حق کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ عبدالرؤف صاحب عباسی اور علی اختر صاحب عباسی کے علاوہ آپ کے والد محترم چودھری رشید علی صاحب عباسی نہایت محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ ہر وقت کے ناشتے اور کھانے پر اگر ہم وہاں موجود ہیں تو نہایت اصرار کے ساتھ شریک کئے جاتے تھے۔ باتوں سے ہر وقت تواضع ہوتی تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا بے حد خیال کیا جاتا تھا۔ مگر یہاں خودداری ہم کو ایک تکلیف بھی تھی۔ وہ یہ کہ عبدالرؤف صاحب عباسی کے ایک چچازاد بھائی بھی عملہ ادارت میں تھے اور

ان کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ گویا ہم براہ راست انہی کے ملازم ہیں۔ عجیب شعلہ مزاج اور
زیربا فطرت پائی تھی آپ نے۔ زبان کے آگے خندق ہی تھا۔ دراصل ان کو یہی بات
ناگوار تھی کہ جو شخص ملازم ہے اس کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ کیوں ہو رہا ہے۔ خیر ان سے
ڈرنے کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اس بات سے کہ کسی دن ان کی بات
پر نہ بگڑ جائے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ عبدالرؤف صاحب عباسی اور
ان کے برادر محترم بھی ان کی ہر بات فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔ چنانچہ صرف وہی
بزرگ عبدالرؤف صاحب کے تعلقات بہت سے لوگوں سے خراب
کرا چکے تھے۔ اور آئے دن کسی نہ کسی سے لڑائی کراتے رہتے تھے ہم نے اس
تصادم سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ اور اپنی فطرت کے خلاف
بے حد ضبط اور درگذر سے کام لیا۔ ورنہ وہ تو گویا ہر وقت تصادم
کے لئے تیار ہی تھے۔ دو سال تک اس تصادم سے بچے۔ مگر آخر کار وہی
حضرت اور ان کا وہی مزاج ہماری روزنامہ حق سے علیحدگی کا باعث
ہوا۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو ہم کو روزنامہ حق کے سلسلہ کی
دوسری تفصیلات میں جانا ہے۔

پنجاب کا دوسرا سفر

روزنامہ حق کی ملازمت ہی کے درمیان ہم کو پھر قادیان جانا پڑا۔ لکھنؤ
میں احمدیت کے خلاف جو پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں مولوی محمد عثمان
صاحب احمدی نے "حقیقت" کے ایڈیٹر انیس احمد عباسی کو اور اس خاکسار کو

کو دعوت دی کہ آپ لوگ قادیان چل کر وہاں کے حالات کا خود مطالعہ کریں اور اپنے اس مطالعہ کی روشنی میں اگر مناسب سمجھیں تو کچھ لکھیں۔ انیس احمد صاحب عباسی نے اور ہم نے علیحدہ مشورہ کیا۔ اور آخر اس دعوت کو منظور کر لیا۔ انیس صاحب کے ساتھ ریل کا سفر نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ آپ کی سفر میں گھبراہٹیں اور اگر کوئی کسی سے کسی قسم کا مذاق کرے تو آپ کی سراسیمگی قابل دید ہوتی ہے اس تمام سفر میں آپ کو یہ انتظار رہا کہ کب اس شوکت کی وجہ سے کسی مسافر سے فوجداری ہوتی ہے۔ اور کب کسی مذاق کے سلسلہ میں شوکت کے ساتھ خود ان کی گت بنتی ہے۔ مگر شکر ہے کہ اس کی نوبت نہ آسکی اور انیس احمد صاحب کی ٹوپی اچھلنے کا تو کیا ذکر ہے۔ ٹوپی اترنے تک موقع نہ آسکا۔ البتہ رات کو جب وہ بے خبر سو گئے تو خود ہم نے ٹوپی ذرا سی کھسکا کر دیکھی۔ کہ آخر سر میں کیا نقص ہے کہ یہ ٹوپی کبھی اتارتے ہی نہیں مگر ہماری سمجھ میں کوئی بات نہ آسکی

اس مرتبہ قادیان پہونچ کر ہم لوگوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ ہر شعبہ کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ خود حضرت صاحب سے ملے۔ اور دعوت بھی ان کے ساتھ کھائی ہمارے اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ اسکول کو دیکھا اور حضرت صاحب کی مکمل سکریٹریٹ کی سیر کی۔ جہاں ہر ایک شعبہ کا علیحدہ ناظم تھا اور جتنے ناظم تھے وہ سب نہایت ایثار کے ساتھ اپنی اعلیٰ قابلیتوں کے باوجود۔ نہایت قلیل معاوضہ پر کام کر رہے تھے۔ برادر محترم مولوی محمد عثمان صاحب نے ہم دونوں کی تواضع اور آرام کا ہر ممکن انتظام ہر جگہ کیا۔ اور آخر ہم سب ایک رائے قائم کر کے وہاں سے واپس ہوئے۔ انیس صاحب سیدھے لکھنؤ آگئے اور مولوی محمد عثمان

صاحب اور ہم لاہور گئے اس مرتبہ بھی ہم لوگ لاہوری احباب سے ملے۔ حکیم یوسف حسن صاحب اور ان کے رفیق کار سید فرید جعفری جو اس زمانہ میں نیرنگِ خیال کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اپنے پرتکلف دسترخوان پر ہم کو ملے۔ سالک صاحب اور اسلم صاحب سے ملاقاتیں رہیں۔ سید امتیاز علی تاج سے ملے اور لاہور کی اگلی دوسری سیر کے بعد اپنے کو لاہور کا اور بھی تشنہ بنا کر واپس آگئے۔

دوستانہ ملازمت

عبدالرؤف صاحب عباسی اور علی اختر صاحب عباسی سے دوستانہ تعلقات پہلے تھے۔ اور ملازمت بعد میں شروع کی تھی۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں دوستی ختم نہ ہو جائے اور صرف خادم اور آقا کے تعلقات نہ رہ جائیں۔ مگر یہ صورت نہ ہو سکی۔ بلکہ دوستانہ تعلقات نے عزیزدارانہ تعلقات کی صورت اختیار کر لی یہی وجہ تھی کہ عباسی صاحب کے ان عزیز کا طرزِ عمل ناگوار ہوتا جاتا تھا۔ ورنہ حال تو یہ تھا کہ دفتر میں کام کے وقت بھی دوستانہ باتیں ہوتی رہتی تھیں اور بعد میں بھی ہم سب کی تفریحات مشترک تھیں۔ وہ اپنے وطن کاکوری جا رہے ہیں اور بضد ہیں کہ شوکت بھی چلیں۔ سینما جا رہے ہیں اور ہم ساتھ ہیں۔ کسی جلسہ میں جا رہے ہیں اور ہمارے بغیر چلتے نہیں۔ مختصر یہ کہ نہایت خوشگوار مراسم تھے۔ آپ کے ایک اور عجیب الخلقت عزیز اسی زمانہ میں تشریف لے آئے اور روزنامہ حق کے شعبہ انتظام میں تھوڑا بہت کام کرنے لگے، یہ حضرت گویا ہم سب کے لیے عجیب تفریحی سامان تھے، ان کے ساتھ چھیڑ دل لگی میں ہم سب برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اور عباسی صاحب کے

والد محترم ہم سب کی شرارتوں کو بڑی پیار کی نظر سے دیکھا کرتے تھے یوں تو گویا بڑی اچھی طرح گذر رہی تھی۔ مگر جان پر ہم کھیلے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح اس کا اندازہ آپ کو نئے ابواب سے ہوگا۔

شب بیداری و صبح خیزی

ہم اس زمانہ میں پھر اپنے ذاتی مکان زرد کوٹھی پر رہتے تھے۔ جو وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہے۔ اور روزنامہ حق کا دفتر ہیوٹ روڈ پر مقبول گنج میں تھا۔ یہ فاصلہ تین میل سے کچھ نہ ہوگا۔ حق صبح تڑکے نکلتا تھا۔ اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ تمام مقامی اخبارات سے پہلے بازار میں پہونچ جائے چنانچہ اس کے خبروں کے ضمیمہ کو مرتب کرنے کے لئے ہم کو چار بجے صبح دفتر پہونچ جانا چاہئے تھا۔ صبح چار بجے دفتر پہنچنے کے لئے ہم رات کو تین بجے بیدار ہوتے تھے۔ اور زبردستی ضروریات سے فارغ ہوکر بائیسکل پر دفتر جایا کرتے تھے۔ کوئی موسم ہو۔ کیسے ہی حالات ہوں۔ مگر ہم کو اسی وقت چلنا پڑتا تھا۔ دسمبر کی قیامت خیز سردی میں لحاف سے جس قسم کے مراسم ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ دسمبر کی کسی رات کو لحاف سے نکل کر کیجئے گا۔ مگر ہم کو اسی زمانہ میں لحاف چھوڑنا پڑتا تھا۔ اور ساڑھے تین بجے کے قریب کانوں پر مفلر لپیٹ کر اور شیروانی پر موٹا سا السٹر پہن کر ہم دفتر جایا کرتے تھے۔ سڑکیں ویران ہوتی تھیں۔ اور راستہ میں ایک آدھ ایسی جگہ بھی ملتی تھی جہاں آسانی سے لوٹ مار ہو سکتی ہے۔ بلکہ جہاں اس قسم کا ایک آدھ واقعہ پہلے بھی ہوچکا تھا۔ مگر ہم کو اطمینان تھا کہ ہم سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا اور اگر پوچھا تو

کہہ دیں گے کہ بھائی تم خود غور کرو کہ ایک ایسے شخص کے پاس تم کو کیا مل سکتا ہے۔ جو اپنی ضروریات سے اس قدر مجبور رہو کہ اس وقت اور اس موسم میں کام پر جا رہا ہو

ایک کتے نے مزاج پوچھ لیا

کسی آدمی نے تو خیر ہم سے اس قسم کا کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر ایک رات جب ہم جیسٹر میں لپٹے دستانے چڑھائے۔ گلوبند میں چھپے بائیسکل کے فراٹے بھرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک کتے نے ہم کو ٹوکا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ روز ہی کتے پوچھا کرتے تھے اور ہم رعیت کہہ کر نکل جایا کرتے تھے۔ مگر یہ کتا شاید نیا نیا تبدیل ہو کر آیا تھا دور ہی سے ہم کو دیکھ کر اس نے ٹوکنا شروع کر دیا۔ مگر جب یہ دیکھا کہ شخص سرکشی سے کام لے رہا ہے اور جھڑکا نہیں مانتا۔ تو ایک مرتبہ جھپٹ اس زور سے ہم کو گھسیٹا ہے کہ ہم معہ بائیسکل کے سڑک کے بیچوں بیچ نہایت اطمینان سے استراحت فرما رہے تھے۔ اور کتا دور کھڑا ہوا اب تک ہم کو ڈانٹ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس کو وہاں سے بھگایا اور اب جو گرد وغیرہ جھاڑتے ہیں تو پتہ چلا کہ جیسٹر کا ایک دامن جیسٹر سے نہ صرف علیحدہ ہو کر لٹک رہا ہے۔ بلکہ اس کا ایک حصہ وہ کتا نوچ کر لے گیا ہے۔ اس روز سے ہم نے برابر اپنے ساتھ ٹارچ رکھنا شروع کر دی اس لئے کہ کتے بھگانے کے چند مجرب نسخوں میں سے ایک نسخہ ٹارچ بھی ہے۔

ہماری کشش

آخرکار ہماری کشش نے دفتر کو اپنی طرف کھینچا اور روزنامہ حق کا دفتر

ہیوٹ روڈ سے منتقل ہوکر گولہ گنج آ گیا یہاں ایک نہایت وسیع محل مرشد آباد پیلس میں دفتر کے علاوہ اپنی رہائش اور پریس کا عبدالرؤف صاحب نے معقول انتظام کرلیا اب گویا یہ جگہ ہمارے گھر سے بقدر نصف میل قریب ہوگئی۔ مگر رات کو اسی وقت اب بھی جاگنا پڑتا تھا۔ اور دفتر اب بھی اسی وقت پہونچتے تھے۔ البتہ سائیکل پر چند پیر کم مارنا پڑتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ۱۶۰۰ کے علاوہ یہ بات خود ہماری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ یہ پابندی ہم سے کیونکر ہوگئی۔ یہی ہم تھے کہ روزانہ صبح تڑکے یعنی دس بجے سو کر اٹھا کرتے تھے۔ آفتاب طلوع بھی ہوا کرتا ہے۔ اس کی ہم کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ ناشتہ ہمارے بستر کے قریب صبح سے دس بجے تک پڑا سوکھا کرتا تھا۔ اور ہمارے نزدیک صبح کا سہانا وقت یہی دس بجے دوپہر کا وقت ہوتا تھا۔ مگر اب گویا ایک سرے سے سوتے ہی نہ تھے رات کو گیارہ بجے دوستوں سے فرصت پا کر آئے۔ اور صبح ہونے سے دو گھنٹے پہلے ہی بستر چھوڑ دیا سوال تو یہ تھا کہ ہم بستر چھوڑ ہی کیسے دیتے اور بستر ہم کو کیونکر چھوڑ دیتا تھا۔ والدہ صاحبہ کو ہماری اس ملازمت سے نہایت شدید اختلاف محض اسی وجہ سے تھا اور باقی لوگ بھی یہی کہتے تھے۔ کہ صاحب یہ ان ہی کا کام ہے کہ اس وقت اس طرح دفتر جاتے ہیں۔

رسالہ کائنات

عبدالرؤف صاحب عباسی نے اس نئے مکان میں آنے کے کچھ دن بعد طے کیا کہ ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی طے کیا کہ اس کی ادارت کی پوری ذمہ داری ہمارے سر رہے گی۔ چنانچہ اس کا نام "کائنات"

تجویز ہوا۔ سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا اور اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان ہی آدم بیزار عزیز کا نام دیا گیا۔ رسالہ کے لیے ہم نے اپنے اثر سے کام لیکر خاص خاص لوگوں کے پیغامات منگائے۔ ملک کے مقتدر ادیبوں کے مضامین جمع کیے۔ اور پہلا نمبر اس قدر شاندار پیش کیا۔ کہ جو دیکھتا تھا داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اس رسالہ کو ترقی دینے کے لیے ہم نے عبدالرؤف صاحب عباسی کی اجازت سے کچھ سرمایہ جمع کرنے کا بیڑہ بھی اٹھایا۔ مگر سوائے ایک رقم کے جو نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب سے حاصل کر سکے اور کوئی بڑی رقم ہم کو حاصل نہ ہوئی۔ البتہ دو ہی تین پرچوں کے بعد اس کے خریداروں کی تعداد کافی پیدا ہو گئی اور رسالہ نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کردی۔ مگر ایک طرف تو روزانہ اخبار کی مصروفیات، دوسری طرف ایک رسالہ جو خود پورا وقت اور پوری توجہ چاہتا تھا۔ آخر پانچ یا چھ نمبروں کے بعد یہ گاڑی آگے نہ چل سکی۔ اور عبدالرؤف صاحب نے اس کو بند کر دیا حالانکہ اس کے بند ہونے کے بعد بھی اس کی مانگ برابر جاری رہی اور اس کے اس قدر جلد بند ہو جانے کو عام طور پر تکلیف کے ساتھ محسوس کیا گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

کائنات ہی کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی تجدید مراسم کی نوبت آئی۔ مولانا کے اور حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار کے درمیان نگار کی مذہبی تحریروں کے سلسلہ میں ایک تاریخی اختلاف رہ چکا تھا۔

جس نے ایک زمانہ میں اچھے خاصے معرکہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور مولانا دریابادی نے نگار کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا۔ لکھنؤ میں اس سلسلہ میں جلسے ہوئے فرنگی محل میں علمائے کرام نے نگار کے خلاف عملی جدوجہد کا بیڑہ اٹھایا۔ امین الدولہ پارک میں ایک جلسہ عام ہوا اور آخر کار نگار کے خلاف متفقہ طور پر یہ طے کر دیا گیا کہ نگار کی ملحدانہ روش کو جاری رہنے دینا غیرت اسلامی کے لیے ناقابل برداشت ہے ہم لوگوں نے نیاز صاحب فتحپوری کو اس حد تک راضی کر لیا تھا کہ وہ نگار کی پالیسی بدل دیں۔ ایک ادبی رسالہ کو محض ادبی رہنے دیں۔ اگر ان کے ذاتی عقائد وہی ہیں جن کی وہ نگار کے ذریعہ تبلیغ کرتے ہیں۔ تو بھی ان کو اپنی ذات تک محدود رہنے دیں۔ وہ صورت اختیار نہ کریں جس سے عام مسلمانوں میں نگار کے لیے نفرت اور غصہ کے آثار پیدا ہوں۔ جب نیاز صاحب ہم لوگوں کے اس مشورہ پر راضی ہو گئے تو ہم نے جلسہ عام میں جو ان ہی کے خلاف ہو رہا تھا۔ اپنی ذمہ داری پر یہ اعلان کیا کہ ہم نیاز صاحب کی طرف سے یہ یقین دلاتے ہیں کہ نگار میں اس قسم کا لٹریچر آئندہ پیش نہ ہوگا۔ مگر اس موقعہ پر بعض حضرات نے نہایت اشتعال انگیز تقریریں کیں اور مطالبہ یہ کیا گیا کہ نیاز صاحب چونکہ عام مسلمانوں کے مجرم ہیں۔ لہذا ان کو اسی جلسہ میں آکر سب کے سامنے غیر مشروط طور پر معذرت خواہ ہونا چاہیے اس کی مخالفت ہم نے بھی کی۔ اور اس کو بانیان جلسہ کی زیادتی قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کشمکش جاری رہی۔ جو اصلاحی صورت اس وقت پیدا ہو رہی تھی وہ بھی نہ ہو سکی۔ اور محض اس تشدد کی وجہ سے اس کشمکش کا سد باب نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ

میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ہم کو بھی "نیاز مندوں" میں شامل سمجھ کر نہ معلوم کیا رائے قائم کر لی تھی۔ اور ان کے تمام اسکول کی رائے ہمارے لئے غالباً یہی تھی کہ یہ بھی ایک بہکا ہوا مسلمان ہے مگر اب قریب سے دیکھ کر کچھ پڑھ کر اور کچھ سمجھ کر آپ نے اپنی رائے میں غالباً کچھ ترمیم فرمائی اور پھر نہایت شفقت سے ملنے لگے۔ رسالہ کائنات کی قلمی اعانت فرماتے رہے بلکہ شوکت کی ہر اعانت کے لئے تیار ہو گئے

مشاعرہ کائنات

اسی زمانہ میں عبدالرؤف صاحب عباسی کی رائے سے ہم نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ طرح تھی ع

تم ہو جس کے ہے اسی کی کائنات

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی سے اس کی صدارت کی درخواست کی۔ اب تو آپ شوکت کی ہر بات مان لیا کرتے تھے۔ یہ درخواست بھی منظور ہو گئی۔ اور آپ نے مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے ایک نہایت دلچسپ جامع اور پر مغز خطبۂ صدارت بھی ارشاد فرمایا۔ جس کا وہ حصہ جو اس خاکسار کے متعلق تھا خصوصیت کے ساتھ بے حد دلچسپ تھا ملاحظہ ہو:۔

> "بزم مشاعرہ اور وہ بھی لکھنؤ میں اور اس کا
> صدر ایک دیہاتی اور دیہاتی بھی کیسا زبان دانی
> کے شعبہ میں بالکل مبتدی اور شعر و سخن کے باب

میں محض غبی، داد بانیٔ مشاعرہ کی خوش طبعی کی دیجیے۔ سبحان اللہ کیا خوب نظر انتخاب پڑی ہے۔ ان کی علمی ظرافت سب پر روشن و آشکار لیکن حقیقت میں آج کی علمی ظرافت ان کا شاہکار دنیا کی نظر میں وہ محض ظریف۔ لیکن آج کے صدر مشاعرہ کے حق میں سمِ تحریف! یہ صدارت کیا ہے قحط الرجال۔ بلکہ نیرنگیٔ دہر کا ایک کھلا ہوا نشان۔ اور ایسی عجیب حقیقت کہ اس پر افسانے کا گمان۔ بلکہ یوں کہیے کہ فسانۂ عجائب کا کوئی ظریفانہ ایڈیشن اگر صاحب کائنات کی سرپرستی میں زیر طبع ہو تو اس کے لئے موزوں عنوان!"

اس خطبہ کے بعد اس خاکسار نے اپنی ایک غیر طرحی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ اس غزل میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

وہ اس غریب نے پایا نہیں مقدر سے
سرِ نیاز کے قابل جو آستانہ تھا

مولانا نے تبسم فرمایا، اور دو بار اس شعر کو پڑھوایا اب ہم سمجھے کہ مولانا اس شعر کو کہاں لے کر پہونچے اور واقعی یہ شعر تو "معرکۂ دگار" پر بڑی اچھی روشنی ڈال رہا تھا۔ ہم بھی سمجھ کر مسکرائے اور مسکراہٹوں کے اس تبادلے سے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کچھ بتا دیا کچھ سمجھا دیا اور کچھ سمجھ گئے۔

شوکت تھانوی مُردہ باد

جماعت احمدیہ کی طرف سے ہر سال جلسۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا کرتا تھا اور ہر جلسہ میں ہم ایک نظم پڑھا کرتے تھے۔ مسلسل چار سال تک ہم نے جلسہ میں نظمیں پڑھی تھیں اور اب تک اس جلسہ میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا مگر ہم تو بڑے مبارک قدم واقع ہی ہوئے ہیں۔ جہاں اور جس معاملہ میں ہمارا دخل ہو جائے۔ پھر خیریت ذرا مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ چنانچہ جس جلسہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کے لئے صدر ہم کو منتخب کیا گیا تھا۔ اور لکھنؤ میں اس جلسہ کے خلاف پروپیگنڈا ہو رہا تھا کہ یہ "قادیانی" جلسۂ سیرۃ النبی صلعم کے پردے میں دراصل اپنی تبلیغ کرتے ہیں۔ اور ان کی "چالاکیوں" کو مسلمان سمجھتے نہیں بلکہ اس دھوکے میں چلے جاتے ہیں کہ یہ جلسۂ سیرۃ ہے۔ مگر ہم پر اس پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہ تھا ہمارے پاس بھی لوگ آئے اور ہم کو منع کیا مگر ہم اپنی رائے پر قائم رہے کہ یہ ذکر رسولؐ ہے اور ذکر رسول خواہ کسی جماعت کی طرف سے بھی ہو ہر مسلمان کے لئے باعث کشش ہونا چاہئے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اب اس اختلاف کی کیا وجہ پیدا ہو گئی۔ اب سے پہلے ہر سال بڑے بڑے غیر احمدی علماء نے اس جلسہ میں شرکت کی تھی۔ غیر مسلم مقرر اس میں حضور سرور دوعالم صلعم کی زندگی پر اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ شیعہ اور سنی علماء ہر مرتبہ شریک رہے تھے مگر اب اس جلسہ کو یکایک احمدی حضرات کا ایک "داؤں" سمجھ لیا گیا تھا بہر صورت ہم نے کسی کی ایک نہ سنی اور جلسہ کی صدارت

کرنے مقررہ وقت پر گنگا پرشاد میموریل ہال پہونچ گئے۔ اس وقت بھی ہال کے دروازہ پر ایک قسم کی پکٹنگ ہو رہی تھی۔ لوگوں کو جلسہ کی شرکت سے روکا جارہا تھا۔ مگر اس کے باوجود جلسہ میں حاضرین کی تعداد کافی تھی۔ ہم نے ایک مختصر سے خطبۂ صدارت کے بعد جلسہ کی کارروائی شروع کردی۔ مگر حاضرین جلسہ میں بہت سے حضرات اسی غرض سے آئے تھے۔ کہ جلسہ میں ابتری پیدا کریں۔ چنانچہ ہال کے اندر ہی کچھ لوگوں نے شور وغل شروع کردیا۔ ہم نے ایک مختصر تقریر میں پھر لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کی کہ آپ حضرات سینما ہاؤسز میں خاموش بیٹھ سکتے ہیں، اور تماشہ کے اختتام پر "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے" والا ترانہ نہایت ادب سے کھڑے ہو کر سنتے ہیں۔ مگر یہاں اس وقت شہنشاہ دوعالمؐ ذکر ہو رہا ہے اور آپ اس کو خود سننا تو درکنار دوسروں کو بھی سننے دینا نہیں چاہتے۔ فرض کرلیجئے کہ یہ جلسہ احمدیوں کا ہے۔ مگر ذکر کن کا ہو رہا ہے۔ جن کے نام لیوا آپ بھی ہیں اور رویہ آپ نے یہ اختیار کیا ہے گویا احمدیوں کی ضد میں آپ ان سے بھی بغاوت کر رہے ہیں۔ جو آپ کے ہیں۔ مگر ان الفاظ کا بھی بہت کم لوگوں پر اثر ہوا اس لئے وہ تو گھر ہی سے طے کرکے آئے تھے۔ کہ جلسہ میں ابتری پیدا کریں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں جلسہ کے باہر بہت کافی مجمع ہوگیا۔ اور لوگوں نے نعرے بلند کرنا شروع کردیئے جو جماعت احمدیہ کے خلاف تھے۔ مگر اس کے باوجود جلسہ کی کارروائی جاری رہی۔ مگر باہر کے شور وغل کا اثر اب ہال کے اندر بھی پہونچنے لگا۔ آخر حاضرین جلسہ میں سے ایک بزرگ نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں جناب صدر سے استدعا کروں گا کہ وہ جلسہ کی کارروائی ختم کردیں۔ اس لئے کہ ہم کو ذکر حبیبؐ سننے

کے لیے جس سکون کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں حاصل نہیں ہو رہا ہے اس آواز کی تائید اور لوگوں نے بھی کی۔ اور اسی وقت باہر سے پھر ایک طوفان اٹھا۔ اب جو نعرے بلند ہو رہے تھے۔ وہ اس خاکسار کے متعلق تھے۔ یعنی "شوکت تھانوی مردہ باد" ادھر سے کچھ لوگوں نے نعرہ بلند کیا "شوکت تھانوی زندہ باد" اور ہم حیران تھے کہ ہم ان دونوں میں سے کس کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیے۔ لوگوں نے ہم کو مشورہ دیا کہ آپ پشت کے دروازے سے نکل جائیے۔ مگر ہم نے اس کو منظور نہ کیا اور اس وقت اپنے دل میں بلا کی جرأت پیدا کر کے ہم صدر دروازہ ہی سے باہر نکلے جہاں دو رویہ لوگوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ ہمارے خلاف نعرے بلند کر رہی تھی۔ مگر ہمارے پہنچتے ہی پھر دو قسم کے نعرے شروع ہو گئے۔ "شوکت تھانوی مردہ باد اور شوکت تھانوی زندہ باد" اور ہم اسی طوفان سے گذر کر سواری تک آ گئے بانیان جلسہ نے اسی درمیان پولس کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ مگر ہم نے باہر نکل کر پولس کو اپنی حفاظت سے روکا۔ اور یہ کہہ کر اس مجمع سے گذرنے لگے کہ میرا فیصلہ ان ہی حضرات کو کرانے دیجیے۔ ایک صاحبزادے کچھ حملہ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھے تھے کہ ان ہی کے چند ساتھیوں نے ان کو روکا۔ اور ہم بخیریت مجمع سے گذر کر اپنے گھر آ گئے۔ گھر پر اس ہنگامے کی اطلاع پہونچ چکی تھی اور سب بے حد پریشان تھے۔ مگر ہم نے گھر جا کر سب کو مطمئن کر دیا کہ دیکھ لو میرے دھڑ پر میرا سر موجود ہے۔ اور میرے تمام اعضاء صحیح سالم ہیں۔

احمدی

اس سے قبل بھی اس بات کی شہرت تھی کہ شوکت تھانوی "قادیانی" ہے

وجہ یہ تھی کہ برادران محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب مولوی محمد عثمان صاحب ڈاکٹر محمد زبیر صاحب اور مولوی محمد طلحہ ایڈوکیٹ احمدی عقائد رکھتے ہیں۔ اور ان ہی کی حقیقی بھتیجی سعیدہ ہیں۔ چنانچہ یہ عام طور پر خیال تھا کہ ایک احمدی لڑکی غیر احمدی کے نکاح میں نہ آئی ہوگی۔ اس لیے کہ احمدی حضرات غیر احمدی لڑکی بیاہ تو لاتے ہیں مگر غیر احمدی کو دیتے نہیں۔ اس کے علاوہ اب تک دو مرتبہ قادیان جا چکے تھے۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سے مل چکے تھے۔ ان کے یہاں دعوت کھا چکے تھے۔ بعض احمدی مسائل پر مضامین لکھ چکے تھے۔ ان تمام حالات کے ماتحت ہمارے احمدی ہونے کی جو خبر گرم تھی اس کو بلا وجہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ مگر اس جلسہ کے بعد تو اس روایت پر گویا تصدیق کی مہر بھی لگ گئی۔ اور اب ہمارے احمدی ہونے کا ان سب کو بھی یقین ہو گیا جو اب تک مشکوک تھے۔ ہم سے جس کسی نے بھی پوچھا ہم نے یہی جواب دے دیا کہ حضرت سچ پوچھیے تو احمدی ہم آپ سب ہی ہیں۔ احمد ہمارے رسول برحق کا اسم پاک تھا اور ان سے نسبت دینا ہم اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں رہ گیا آپ کا یہ خیال کہ ہم مرزا غلام احمد صاحب کو مسیح موعود مانتے ہیں یا نہیں اس کے متعلق ہم نے آج تک غور ہی نہیں کیا ہے۔ البتہ احمدی حضرات کے اسلامی جوش ان کے اسلامی اصولوں پر سختی سے کاربند ہونے اور تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلہ میں ان کی دیوانہ وار سرگرمیوں کو ہم بیشک نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگ یہی کہتے رہے کہ صاحب یہ کیونکر ممکن ہے کہ شوکت قادیانی نہ ہوں، اور سر ظفر اللہ خان ان کے دیوان پر گول میز کانفرنس کے اجلاس

کی مصروفیتوں کے باوجود لندن میں بیٹھ کر تبصرہ لکھیں۔ خلیفہ صاحب قادیان اپنے خطبہ جمعہ میں ان کی سووینئر ریل کا ذکر کریں۔ اور قادیانوں کا اخبار الفضل ان کا ذکر اپنے کالموں میں کرے۔ مگر ہم نے اپنی احمدیت کی اس شہرت پر سنجیدگی کے ساتھ کبھی غور نہیں کیا اس لئے کہ اول تو ہم مذہبی آدمی نہیں ہیں۔ دوسرے اگر مذہبی آدمی ہوتے تو مذہب کے معاملہ میں خدا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے نہ کہ اس کے بندوں کو، مذہب تو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک رشتہ کا نام ہے۔ یہ کوئی سوسائٹی کی چیز نہیں۔

روزنامہ حق سے علیحدگی

آخر وہی خطرہ سامنے آیا۔ حق کے مالک و مدیر عبدالرؤف صاحب عباسی ان کے برادر محترم علی اختر صاحب عباسی اور ان کے والد محترم مولوی رشید علی صاحب کی تمام محبتوں اور تمام مدارات کے باوجود ان حضرات کے قریبی عزیز سے ہم کو اندیشہ تھا۔ وہی اپنی تمام مخالفتوں کے ساتھ اب بالاعلان سامنے آ گئے۔ اب عبدالرؤف عباسی کے لئے ایک دوست اور ایک عزیز کا معاملہ تھا (لاٹھی) مارے مارے پانی جدا نہیں ہوتا۔ بلکہ گھٹنے پیٹ ہی طرف جھکتے ہیں۔ ہم اگر یہ مطالبہ کرتے کہ ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیا جائے تو غلط ہوتا۔ لہذا ہم نے اپنی شکایت کے ساتھ استعفیٰ پیش کر دیا۔ حق کی ملازمت کے زمانہ میں جو محنت ہم نے کی تھی۔ اور جس خلوص سے کام کیا تھا۔ اس کے پیش نظر ہم کو ایک وہم بھی تھا کہ ہم نے بھی تھوڑا بہت استحقاق پیدا کر لیا ہے۔ اور حق کے حق داروں میں

ہم بھی ہیں۔ مالی حیثیت سے نہ سہی۔ اخلاقی حیثیت سے سہی کم سے کم اتنا حق تو ہمارا بھی تھا کہ ہمارے اس استعفے پر ہمدردانہ غور کیا جاتا مگر بجائے اس کے ہوا یہ کہ عبدالرؤف صاحب عباسی نے ایک دم اپنی نظریں ایسی پھیر لیں کہ گویا کبھی ہم اسم تھے ہی نہیں لہٰذا ہم نے اپنے باقی مطالبات سے بھی ہاتھ اٹھائے اور بجائے اس کے رہے سہے تعلقات کو بھی ختم کر دیا جاتا ہم نے ملازمت ہی کو ختم کر دیا۔

رفیع احمد خاں کی مداخلت

ہماری اس علیحدگی کی خبر سن کر رفیع احمد خاں نے بغیر ہمارے مشورے کے مداخلت کی اور عبدالرؤف صاحب عباسی کو سمجھایا کہ شوکت کو واپس بلانا چاہیے مگر ان کو جواب یہ ملا کہ "خان صاحب آپ دیکھتے رہئے وہ حضرت ادھر ادھر جھک مار کر خود آ جائیں گے۔ کون دیئے دیتا ہے چالیس روپیہ ماہوار کی ملازمت" خان صاحب کو یہ جواب ناگوار ہوا اور وہ پہلے تو پی گئے۔ مگر کچھ دن بعد ہم کو بتایا کہ انہوں نے صلح صفائی کی کوشش کر کے یہ جواب سنا تھا۔ ہم نے خان صاحب سے کہا آپ اسی کے مستحق تھے۔ خان صاحب ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔ کہ مجھ کو دنیا میں جن چند باتوں پر حیرت ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شوکت "حق" میں کیونکر ملازم ہیں، اور یہ ملازمت کیونکر نبھتی چلی جا رہی ہے۔ عبدالرؤف صاحب عباسی کے اس آخری طرز عمل اور رفیع احمد خاں نے ان کے جو الفاظ ہم کو پہنچائے تھے ان کی کچھ دنوں تک تو ہم کو شدید تکلیف رہی۔ مگر رفتہ رفتہ ہم ان تمام باتوں کو بھول گئے اور عبدالرؤف صاحب عباسی اور ان کے تمام خاندان سے پھر دوستانہ تعلقات

قائم ہوگئے۔ جو آج تک موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات کی وجہ سے ہم کو حق سے دست بردار ہونا پڑا۔ ان کے ساتھ کبھی ہم نے کوئی دشمنی کا خیال اپنے ذہن میں کبھی نہ آنے دیا اس لئے ہم کو یقین تھا اور ہے کہ وہ حضرات ہمارے ساتھ تو کیا خود عبدالرؤف صاحب عباسی کے ساتھ کوئی دوستی نہیں کر رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے نقصانات کے علاوہ جو ان کی وجہ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ہر دلعزیزی کو برابر پہونچتے رہتے ہیں، کوئی نہایت شدید قسم کا نقصان ضرور پہونچے گا۔ اور آج نہ سہی کل سہی۔ عبدالرؤف صاحب کو قائل ہونا پڑے گا۔ کہ ان کے یہ عم زاد برادر عزیز ان کے راستے میں کس قسم کے کانٹے بوچکے ہیں

خان بہادر سید عین الدین صاحب

خان بہادر سید عین الدین صاحب او، بی، ای، موجودہ دیوان ریاست ہمارے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو اس خاکسار کے ساتھ "للہی خلوص" ہے۔ آپ نے جب یہ سنا کہ شوکت ان حالات کے "ماتحت حق" سے علیحدہ ہو گیا ہے تو فوراً ہم کو طلب کیا۔ اور نہایت جوش فرمایا کہ آخر تم اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو۔ اخبار خود کیوں نہیں نکال لیتے۔ عرض کیا کہ اللہ کا دیا یوں تو سب کچھ ہے صرف روپیہ پیسے کی ذرا کمی ہے۔ کہنے لگے۔ اس کا انتظام میں کردوں گا۔ ایک اچھے روزنامہ اخبار کی اسکیم بنا کر مجھے دو۔ اور شبیر احمد صاحب تلوی کو ہدایت کی۔ کہ شوکت کے سر پر سوار ہو کر اسکیم فوراً مرتب کرالو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ پھر ملازمت

کے پھیر میں پڑیں۔ چنانچہ ہم نے ایک اسکیم مرتب کی اور خان بہادر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ دوسرے ہی دن سے خان بہادر صاحب نے اپنے نہایت قیمتی وقت کا ایک حصہ اس کام کے لئے وقف کر دیا۔ موٹر پر ادھر جا رہے ہیں ادھر جا رہے ہیں۔ ان راجہ صاحب سے ملے۔ ان تعلقہ دار صاحب سے کہا اور کہنا کیا وہاں تو نادر شاہی حکم ہوتا تھا کہ آپ اتنا روپیہ شوکت کو یا مجھے دے دیجئے۔ نتیجہ یہ کہ چند ہی دن میں اتنا سرمایہ ہمارے لئے جمع کر دیا۔ کہ اخبار نکالا جا سکتا تھا۔ راجہ صاحبان اور تعلقہ دار صاحبان نے یہ طے کیا کہ یہ اخبار ان کی پارٹی کا آرگن ہوگا۔ خان بہادر صاحب نے فرمایا اچھا یہی سہی۔ مگر اخبار نکلتا بھی ایسا چاہیئے جو اس پارٹی کے شایان شان ہو۔ لکھنؤ میں یہ گشت کرنے کے بعد خان بہادر صاحب دورے پر روانہ ہوگئے۔ اور ہم کو ہمارے کام کے لئے علی گڈھ طلب کیا گیا۔ علی گڈھ میں نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں سے ایک گراں قدر عطیہ دلوایا اور ہم سے چند دوسرے رؤسا کو بھی ملوایا کہ ان حضرات سے بھی ضرورت کے وقت مدد لیتے رہنا۔ خان بہادر صاحب کی اس غیر معمولی توجہ نے ہمارے ذاتی روزنامہ کی داغ بیل آخر کار ڈال ہی دی ۔

طوفان اور اس کا دفتر

روزنامہ کا نام "طوفان" طے پایا چودھری خلیق الزماں صاحب نے "ہنگامہ" تجویز کیا تھا۔ مگر اکثریت کی رائے طوفان کے حق میں رہی لاٹوش روڈ

پر ایک معقول مکان دفتر کے قیام اور ہمارے رہنے کے لیے کرایہ پر لیا گیا۔ طوفان کا زبردست سائن بورڈ لگایا گیا۔ اور دفتر کے ابتدائی انتظامات شروع کر دیئے۔ ہماری منہ بولی خالہ بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب کی مامتا اس موقع پر آڑے آئی آپ نے ہمارے دفتر کے لیے تمام فرنیچر اپنی طرف سے دیا۔ اور اس طرح ہماری ذاتی زندگی کی بنیاد میں خان بہادر سید علیم الدین صاحب کے ساتھ ہی ایک پتھر ان محترمہ نے بھی رکھ دیا۔ ہم نے اپنا عملہ منتخب کیا۔ خان محبوب طرزی کو اپنا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا۔ اس لیے کہ آپ ہمارے ساتھ سرپنچ کے علاوہ اودھ اخبار میں بھی رہے تھے۔ روزنامہ ہمدم میں بھی ہم نے آپ کو بلا لیا۔ اور اب طوفان کے اجراء کے وقت ہم کو آپ سے زیادہ مناسب معاون کوئی اور نہ مل سکتا تھا۔ برادرم امین سلونوی کی انڈی پنڈنٹ نیوز سروس کی خدمت ہمارے لیے موجود تھی۔ نسیم صاحب کے انتظامی مشورے ہم کو حاصل ہی تھے۔ مختصر یہ کہ ان سب نے مل کر چھپر اٹھایا۔

نمونے کا پرچہ

تمام ابتدائی انتظامات کی تکمیل کے بعد ۱۰ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء کو ہم نے طوفان کا نمونہ کا پرچہ نکالا اور اعلان کر دیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون سے شروع ہوگی۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے خریدار فراہم کرنے، ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات کو مکمل کرنے میں صرف کر دیئے اور آخر یکم جون کو باقاعدہ اشاعت شروع ہو گئی اتفاق

سے اسی زمانہ میں زمیندار کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ مہاراجہ دربھنگہ صدر اور مہاراجہ صاحب جہانگیر آباد صدر مجلس استقبالیہ تھے۔ تعلقہ داران اودھ کی طرف سے طوفان کی کوئی خاص اعانت تو نہ ہوئی تھی مگر وہ اس کو اپنا ہی اخبار سمجھتے تھے۔ اور کانگریس کی کسان سدھار تحریک سے خائف ہو کر اپنی تنظیم کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان کی شکارگاہ میں کانگریس شکار کھیلنا نہ شروع کر دے۔ طوفان نے زمینداروں کی ہر ممکن وکالت کی۔ مگر اس کا کوئی صلہ طوفان کو نہ مل سکا۔ جن تعلقہ داروں نے انفرادی حیثیت سے امداد کی تھی وہ ہمارے ذاتی تعلقات یا خان بہادر سید عین الدین صاحب کے اثر کے ماتحت لیکن انجمن تعلقہ داران اودھ کی طرف سے کوئی دست اعانت دراز نہیں ہوا۔ اخبار کا خیر مقدم تو خیر سب ہی نے کیا۔ بڑی بڑی امیدیں دلائیں اور بڑی بڑی توقعات قائم کیں مگر تجوری کسی نے بھی نہ کھولی۔

ہاتھی باندھ لیا

روزنامہ اخبار کے مصارف اور ہمارا ایسا فاقہ مست محض خریداروں کا چندہ ایک روزنامہ کو چلانے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے سرمایہ دار ایک روزانہ اخبار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ ہمت اور استقلال کا جہاں تک سوال ہے اس کی ہم میں کمی نہ تھی۔ قلمی خدمت کے علاوہ دوڑ دھوپ بھی کافی کر سکتے تھے۔ مگر قسمت کی خوبی ملاحظہ ہو کہ خان بہادر سید عین الدین صاحب بھی ریٹائر ہو گئے۔ اور یہ ہاتھی ہمارے دروازے پر بندھا ہوا چھوڑ گئے۔ کچھ دنوں

تک تو ہم اس ہاتھی کے لئے چارہ فراہم کرتے رہے۔ آج خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی نے ایک عطیہ دے دیا۔ تو کل نواب صاحب چھتاری سے کچھ حاصل کرلیا۔ تعلقہ دار صاحبان کو متوجہ کیا کہ آپ اس کو اپنا پرچہ کہتے ہیں تو اس کو سنبھالئے۔ مگر وہ ٹھہرے رئیس، ان کو بھلا اس کی کیا فکر کہ ان کی غفلت کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ آخر کار ان کی طرف سے مایوس ہو کر پہلے تو گھر کا جو بچا کھچا تھا۔ وہ سب اخبار کی نذر کر دیا۔ اس کے بعد برادر محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب سے کچھ روپیہ قرض لیا اور وہ اپنی ایک کتاب کا حق تصنیف حاصل کر کے ادا کیا۔ اپنی منہ بولی خالہ اماں بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب سے کچھ قرض لیا اور سب کچھ اخبار میں لگا کر اس طوفان کی نذر کر دیا ؂

طوفان گذر گیا

"طوفان" طوفان بن کر آیا۔ اور طوفان بن کر ہم کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا اور اب ہم پھر گھر کے رئیس تھے۔ وہ تو کہئے کہ عین اسی زمانہ میں آل انڈیا ریڈیو نے اپنا لکھنؤ اسٹیشن کھول دیا۔ اور ہم کو ریڈیو سے کافی آمدنی ہونے لگی تھی۔ تقریریں، ڈرامے اسکیچ سب ہی کچھ تو لکھ رہے تھے۔ پھر ایک موقع یہ بھی مل گیا کہ ہماری دو کتابیں ایک ہندی کے پبلشر نے ہندی میں پیش کرنے کے لئے ہم کو معقول معاوضہ دے دیا اور یہ روپیہ ہم نے بیگم کے حوالہ کر دیا۔ کہ آپ سعید اور خورشید کی ختنہ دھوم سے کرانا چاہتی ہیں۔ تو اپنی اس دھوم دھام کو اسی روپیہ کی حدود میں رکھئے گا مگر روپیہ صرف ہو ادوسری صورت سے ؂ ۔

خورشید کو ڈفتھیریا

اس وقت چھوٹے اور آج کے منجھلے صاحبزادے خورشید عمر کو یکایک بخار ہوگیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹمپریچر بہت بڑھ گیا۔ اس نے ایک دن شکایت کی کہ میرے حلق میں درد ہے۔ اور ہم نے یوں ہی دیکھنے کے لئے زبان پر چمچ رکھ کر حلق جو دیکھا تو خفیف سا ایک سفید رنگ کا دانہ سا معلوم ہوا۔ دل نے فوراً کہا کہ یہ ڈفتھیریا تو نہیں ہے۔ دوڑے ہوئے گئے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اختلاف کیا۔ مگر ہم مطمئن نہ ہو سکے۔ اور ایک دوسرے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ ان صاحب نے کچھ خفیف سا شبہ ظاہر کرتے ہوئے حلق کے لعاب کا کیمیاوی امتحان کرنے کا مشورہ دیا۔ اس تمام کارروائی میں شام ہوگئی۔ مگر امتحان کا نتیجہ وہی نکلا کہ ڈفتھیریا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن تو خود دیا اور ہم کو مشورہ دیا کہ اسی وقت بچے کو میڈیکل کالج لے جاؤ۔ ڈفتھیریا کی تصدیق نے جان تو نکال ہی لی تھی مگر حواس قائم تھے۔ ہم نے فوراً ایک ٹیکسی پر بچے کو میڈیکل کالج پہونچایا اور وہاں اسی وقت داخلہ ہوگیا۔ اور دوسرا انجکشن دے دیا گیا۔ اب میڈیکل کالج میں ہم تھے۔ اور یہ بچہ۔ لاکھ لاکھ سب نے کہا کہ ہم اس کے ساتھ رہ جائیں گے مگر ہم نے یہ خطرہ کسی اور کو دینا مناسب نہ سمجھا بلکہ متعدی امراض کے اس وارڈ میں جہاں ہر طرف ڈفتھیریا کے مریض تھے بچے کو لے کر خود ہی اسپتال میں رہے۔ پہلی رات تو پلک تک نہ جھپکائی۔ اس لئے کہ خورشید خطرہ سے باہر نہ تھا دوسرے ہر طرف

مریضوں کے کراہنے کی آوازیں موت کی خبریں۔ جانکنی کی اطلاعات آرہی تھیں اور ایک عجیب وحشت خود ہم پر طاری تھی۔ چاہتے یہ تھے کہ خورشید آرام سے سو جائے ہم خواہ سوئیں یا نہ سوئیں۔ ڈفتھیریا کے دوسرے مریض بچوں کو دیکھ دیکھ کر حواس گم تھے۔ کسی کی گردن کی رگیں کٹی ہوئی تھیں۔ اور کبوتروں کے پروں سے ان کو صاف کیا جاتا تھا۔ کسی بچے کو لوگ اس انتظار میں لئے بیٹھے تھے۔ کہ اب یہ آخری سانس لیتا ہے۔ اور کسی کے متعلق یہ شبہ تھا کہ یہ سانس لیتا بھی ہے یا نہیں؟ اسی وحشتناک ماحول میں گھبرا گھبرا کر نہ معلوم کس طرح صبح کی۔ صبح ڈاکٹر نے خورشید کو دیکھ کر ہم سے کہا کہ آپ نے تو بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کو مات کر دیا۔ اور ڈفتھیریا کو اس وقت پہچان لیا جب اس کی طرف خیال ہی مشکل سے منتقل ہوتا ہے ہم خود حیران تھے کہ یکایک ڈفتھیریا کا خیال کیونکر آگیا۔ کسی اور مرض کا خیال کیوں نہ ہوا۔ مگر یہ بھی دراصل تائید غیبی تھی۔ اور خداوند کریم کو منظور تھا کہ بچہ بچ جائے۔ لہذا ہماری آنکھیں اس طرح کھول دی گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم کو یقین دلایا کہ اب بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وقت پر روک تھام ہوگئی ہے مرض آگے نہیں بڑھا ہے یہی سب سے بڑی بات ہے۔ ورنہ یہ مرض دیکھتے ہی دیکھتے اور ذرا سی غفلت میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے۔ ہم تو خیر خورشید کے پاس تھے۔ مگر سعیدہ کا برا حال تھا وہ گھر پر پریشان تھیں۔ میڈیکل کالج کے قرب کی وجہ سے سعیدہ معہ اپنے تمام متعلقین کے زرد کوٹھی میں آگئی تھیں۔ اور روز شام کو دیکھنے آیا کرتی تھیں۔ آجکل ان کو بچے سے زیادہ ہمارے حال ترس آتا تھا کہ ہم اس طرح بچے کے ساتھ اسپتال میں پڑے ہیں۔ رات کو زمین پہ ذرا کمر سیدھی کر لیتے ہیں۔ دن رات بچے کی

ناز برداری کرتے ہیں۔ اور تمام خلاف معمول مشفقت کا اثر ہماری صحت پر پڑ رہا تھا۔ مگر خیریت یہ ہوئی کہ خورشید میاں جلد جلد سنبھلنے لگے اور ہم کو زمین ہی پر سہی نیند آنے لگی۔ آخر آٹھ دس روز کے بعد ان کے حلق کے لعاب کا پھر معائنہ ہوا اور یہ طے ہو گیا کہ مرض کا اب کوئی اثر نہیں ہے۔ لہذا ہم ان کو بخیریت تمام اسپتال سے لے کر گھر آ گئے۔ اس سلسلہ میں وہ تمام روپیہ جو ان کی تقریب کے لئے رکھا گیا تھا۔ ان کی زندگی حاصل کرنے پر صرف ہو گیا۔ اور ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر ان ہی داموں یہ حضرت ہم کو واپس مل گئے تو ہم گویا سستے چھوٹے ورنہ اعمال تو ایسے نہ تھے کہ خدا اتنا بڑا فضل ہم کرتا۔

ختنہ اور اس کی تقریب

عورتوں کے واسطے تو خیر ہزاروں مصیبتیں ہیں اور اگر وہ ذرا مصیبت پر کمر باندھ لیں تو ہر سال موت اور زندگی کے امتحان میں پڑ سکتی ہیں۔ مگر مردوں کے لئے بھی ختنہ ایک امتحان سے کم نہیں ہے۔ سعید اور خورشید کافی بڑے ہو گئے تھے۔ اول تو ہم کو اپنی غلطی کا افسوس تھا کہ جس وقت یہ حضرت نہالیے پر تھے، اسی وقت اس مرحلہ سے فرصت کیوں نہ کر لی۔ عقیقہ اور ختنہ اگر ساتھ ہی جاتا تو آج یہ فکر نہ ہوتی۔ اور اب زیادہ دیر کرنا اس لئے مناسب نہ تھا کہ فی الحال تو خیر وہ سمجھدار ہوئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری اس غفلت کی بدولت بغیر ختنہ کے بالغ ہو جائیں آخر بیگم صاحبہ کے مسلسل تقاضوں سے مجبور ہو کر پہلے تو چپ چپاتے ختنہ کرا دیا اور پھر جب وہ صحت یاب ہو گئے تو ایک معمولی سی تقریب کر کے ان کا غسل صحت کر دیا

حالانکہ ختنہ اور غسل صحت کے درمیان بیچاروں پر عجیب عجیب مصیبتیں گزریں مارے احتیاط کے ہم نے ڈاکٹر کو بھی ختنہ کے وقت بلا لیا تھا۔ اور نائی نے جیسے ہی چھوٹ پائی۔ ڈاکٹر صاحب نے زینی پٹی چڑھادی تھی۔ مگر کچھ ہی دن کے بعد زخم کے اردگرد زہریلے چھالے پیدا ہوگئے۔ اب نائی نے کہا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی کرامت ہے۔ اور ڈاکٹر نے کہا کہ یہ نائی کے استرے کا زہر ہے۔ مختصر یہ کہ بچے بیچارے ساجھے کی ہانڈی بن کر رہ گئے تھے۔ شکر ہے کہ ہانڈی ٹوٹتے سے بچی۔ اور جتنا دکھ ان غریبوں نے اٹھایا تھا۔ اس کا تھوڑا بہت بدل ان کو غسل صحت کے موقع پر مل گیا۔ جب وہ دولہا بن کر محفل میں آئے اور گھر میں مہمانوں کی چہل پہل دیکھی۔

آغا کا روپیہ

میں اس سے پہلے "تاش اور بازیاں" کے زیر عنوان یہ کہہ چکا ہوں کہ تاشوں کے شوق کے پیچھے ایک مرتبہ پوری تنخواہ ہار گیا تھا۔ اور نسیم صاحب سے کہہ کر ایک آغا سے روپیہ قرض لیا تھا۔ اس روپیہ کا سود ہر مہینے ادا ہوتا رہا مگر اصل ادا کرنے کی نوبت کبھی نہ آ سکی۔ وجہ یہ تھی کہ آمدنی سب بیگم کے ہاتھ میں جاتی تھی اور چند روپے بہانے بازیاں کر کے اور بیگم کو بہلا پھسلا کر ان سے ہم لے لیتے تھے۔ جو آغا کے روپے کا سود دیا کرتے تھے۔ یہ سود ہم آغا کو نہیں بلکہ نسیم کو دے دیتے تھے کہ تم دے دینا۔ ایک دن اتفاق سے وہ پرونوٹ ہم نے بیگم صاحبہ کے قبضہ میں دیکھا اور جان ہی تو نکل گئی۔ کہ یہ ان کے پاس کہاں سے آیا اور ان

کو کیسے خبر ہو گئی۔ بیگم نے اس راز کے کھل جانے کے بعد ہماری بری طرح خبر لی اور اس قدر شرمندہ کیا کہ اگر خدانخواستہ غیرت دار ہوتے تو پھر ان کو منہ نہ دکھاتے۔ آخر ان سے معلوم ہوا کہ وہ بہت دنوں سے آغا کی قائم مقامی کر رہی ہیں۔ نسیم صاحب نے مارے دوستی کے ان سے کہہ دیا کہ شوکت صاحب نے اتنا عرصہ ہوا اس قدر رقم ایک آغا سے قرض لی تھی۔ اور سود کے طور پر اس سے دگنی رقم ادا کر چکے ہیں۔ اگر اس روپیہ کا انتظام کر دیا جائے تو سود کا یہ سلسلہ ختم ہو۔ بیگم نے روپیہ دے کر پرونوٹ لے لیا۔ اور نسیم صاحب سے کہا آپ شوکت صاحب سے ہر ماہ سود لیتے رہیے۔ اور مجھ کو دیتے رہیئے۔ چنانچہ وہ سود کی رقم معلوم نہیں کتنے دنوں سے ان کے پاس جا رہی تھی۔ اور اس طرح غالباً وہ بھی اتنا روپیہ وصول کر چکی تھیں جس قدر پرونوٹ حاصل کرنے پر آغا کو ادا کرنا تھا۔ مگر اس سلسلے میں جو شرمندگی ہم کو اٹھانا پڑی ہے۔ اس کو ہم عمر بھر نہیں بھول سکتے۔ واقعی ایک آغا سے قرض لینا بہت چھوٹی سی بات تھی۔ اور اس سے بھی چھوٹی بات یہ کہ تاش کھیلنے کے سلسلے میں یہ حرکت کرنا پڑی تھی۔ اس واقعہ کو یاد کر کے خود اپنے سے نفرت ہو جایا کرتی ہے۔

چوری

اب کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ مارے صفائی اور سچائی کے ہم اپنی کسی چوری کا حال بھی لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔ جی یہ چوری ہم نے نہیں کی تھی بلکہ ہمارے یہاں ہوئی تھی اس زمانہ میں ہمارے یہاں ایک ملازم تھا۔ اور ایک تھی اس کے ساتھ عورت جس کو وہ اپنی بیوی کہتا تھا اور ہم کو یقین تھا کہ یہ اس کی داشتہ ہے ان ملازم صاحب

کے عشق کا یہ عالم تھا کہ اس عورت کو دیوی کی طرح پوجتے تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا کریں کیا پا جائیں اور لیے دے کر اس کی صرف ایک مسکراہٹ حاصل کریں، جب دیکھئے مٹھائیاں لا رہے ہیں اچھے اچھے کپڑے خرید رہے ہیں۔ ان کے بناؤ سنگار میں مصروف ہیں۔ مگر اس کے ساتھ کام میں کوتاہی نہ کرتا تھا۔ اور ایمانداری کا سکہ بھی ایسا بٹھا دیا تھا کہ ہم سب اس پر گھر چھوڑ کر شہر کے باہر تک چلے جاتے تھے ہفتوں وہ تنہا گھر رہتا تھا۔ اور بیوی یا داشتہ سے دل بہلایا کرتا تھا۔ ہم لوگ پہاڑ جا رہے ہیں اور وہ گھر کے محافظ ہیں مگر ایک دن ایک مختصر سے سفر سے واپس آ کر دیکھا کہ ملازم صاحب معہ اپنی دلنواز کے غائب، فوراً گھر کی تمام چیزوں کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ کچھ نقد روپیہ، کچھ زیور جو ان کے ہاتھ لگ سکا۔ لے کر غائب ہوئے ہیں یعنی اچھا خاصا ہاتھ صاف کر گئے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ لکھوائی۔ مگر پولس کی طرف سے تو یہ مطالبہ ہوا کرتا ہے۔ کہ بتا دو وہ کہاں ہے پھر ہم پکڑ لیں گے۔ ان حضرت کا کبھی پتہ نہ چلا اور زیور پر زکوٰۃ نہ نکالنے کا یہ پھل ہم کو مل گیا۔ کہ یکمشت سب کی ادائیگی ہو گئی۔

پرائیوٹ سیکریٹری

طوفان کے بند ہو جانے کے بعد سے ہم بیکار تو تھے ہی ایک صاحب نے ہم کو ایک راجہ صاحب کا یہ پیغام دیا کہ اگر تم چاہو تو میرے یہاں پرائیوٹ سکریٹری کی جگہ خالی ہے، چلے آؤ۔ راجہ صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری! بات تو کچھ اونچی سی معلوم ہوئی بن سنور کر حاضر ہو گئے اور اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ راجہ

صاحب نے ہمارا مشاہرہ یکصد پنجاہ ۱۵۰ روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ اور ضروری ہدایات دیدیں راجہ صاحب کے حرم سرا میں تشریف لے جاتے ہی لوگوں نے تعزیت کے لئے ہمارے پاس آنا شروع کر دیا۔ کہ سنا ہے کہ آپ پرائیویٹ سکریٹری ہوئے ہیں۔ اب صبح ہی آپ سے فرمائش ہوگی کہ دس ہزار روپیہ قرض کا فوراً انتظام کر دو، اگر آپ نے انتظام کر دیا تو خیر ورنہ کل ہی قدر عافیت معلوم ہو جائے گی ::

ہم دل ہی دل میں ہنستے کہ یہ لوگ ہم کو بھڑکا رہے ہیں۔ اتنا بڑا۔ راجہ بھلا یہ حرکت کرے گا۔ اس قسم کے لوگ ایسے درباروں میں ہمیشہ رہتے ہیں۔ جو خود وارے نیارے کرتے ہیں اور نئے آنے والوں کے قدم کسی طرح جمنے نہ دیں۔ تاکہ ان کی لوٹ مار میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ راجہ صاحب کی ریاست کافی بڑی تھی حکومت میں ایک خاص اقتدار آپ کو حاصل تھا۔ خطاب یافتہ تھے اور یہ مسخرے ہم کو سمجھا رہے تھے۔ کہ راجہ صاحب صبح ہوتے ہی ہم سے قرض کی فرمائش کریں گے ہم ان ہی باتوں پر غور کر رہے تھے کہ راجہ صاحب کے پرانے پرائیویٹ سکریٹری صاحب تشریف لے آئے۔ جن کے متعلق جب بار بار ہم کو یقین دلایا گیا کہ آپ واقعی پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ اور آپ ہی کی جگہ پر ہم بلائے گئے ہیں۔ تو ہم کو یقین آسکا۔ ورنہ آپ کسی طرح بھی پرائیویٹ سکریٹری تو درکنار پڑھے لکھے آدمی ہی نظر نہ آتے تھے آپ راجہ صاحب کے منتظر تھے۔ اور یہ انتظار کے لمحات آپ نے ہمارے پاس بیٹھ کر گذارے۔ اس عرصہ میں معلوم یہ ہوا کہ آپ اپنی بقیہ تنخواہ حاصل کرنے آئے ہوئے ہیں۔ جو سات مہینے کی واجب الادا ہے۔ ہم ایک دم اچھل پڑے اور ان سے پھر اس بات کی تصدیق چاہی تو معلوم ہوا کہ آپ نے اس جگہ پر

آٹھ مہینے کام کیا ہے جس میں صرف ایک مہینے کی تنخواہ چار قسطوں میں ملی تھی۔ باقی سات ماہ کی واجب الادا ہے۔ اور اسی کے مطالبہ پر ان کو علیحدہ کیا گیا ہے اب تو ہمارے ہوش اڑنے کے لئے پر تولنے لگے کہ اتنے میں راجہ صاحب بہادر تشریف لے آئے۔ اور ہمارے پاس ان حضرت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر فرمایا "شوکت صاحب ان سے حساب بنوا لیجئے اور کہہ دیجئے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو آئیں۔ ان حضرت نے آگے بڑھ کر کہا۔ حضور اس عرصہ میں فاقوں مر جاؤں گا۔"

راجا صاحب نے فرمایا۔ "اچھا ان کو دس روپے دیدیجئے۔"

ان حضرت نے پھر دست بستہ عرض کیا، "سرکار دس روپے میں بھلا کیا کام ہو سکے گا۔"

راجہ صاحب نے ہم کو بلا کر کان میں کہا، "پہلے پندرہ دو، پھر نہ مانے تو بیس دے کر ٹال دو۔ بڑا کمبخت ہے یہ۔"

ہم نے تعمیل حکم میں ان صاحب کو بیس روپے دے کر رسید لے لی۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ خود ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اگر ہمارے ساتھ بھی راجہ صاحب نے یہی سلوک فرمایا۔ تو ہم تو گویا کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ ایک بزاز نے آکر سلام کیا۔ اور نہایت عاجزی سے کہا کہ اگر اس کے بل کا نصف بھی ادا کرا دیں تو وہ ہم کو ایک ٹھنڈے سوٹ کا سوتی کپڑا اسی وقت دے گا۔ اور کل بل ادا کرا دیں تو ریشمی سوٹ بنوا دے گا۔ ہم نے یہ تمام باتیں جا کر راجہ صاحب سے کہہ دیں کہ وہ ہم کو اس شرط پر سوتی سوٹ دے رہا ہے اور

اس شرط پر ریشمی سوٹ۔ اب فرمائیے سوتی سوٹ لوں یا ریشمی سوٹ راجہ صاحب نے اس کا حساب پیش کرنے کا حکم دیا۔ یہ حساب کچھ ہزاروں کا نہیں بلکہ پانچ چھ سو روپے کے لگ بھگ ہوگا۔ راجہ صاحب نے سرسری طور پر حساب دیکھ کر کہا، "ٹھگ ہے یہ ڈکیتی کرتا ہے اسے پچاس روپے کا ایک چک دے کر رخصت کرو۔"

ہم نے تعمیلِ حکم میں بزاز سے کہا کہ پچاس روپے کی ادائیگی کا حکم ہوا ہے بزاز نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور آخر راجہ صاحب نے بلا کر اس کو اس قدر ڈانٹا ہے کہ توبہ بھلی مگر وہ برابر دعائیں دیتا رہا۔ اور آخر دو سو روپے کا چیک لیکر وہاں سے ٹلا اور ہم کو اس نے اس سلسلہ میں پانچ روپے دینا چاہے مگر ہم نے انکار کر دیا جس پر اسے سخت حیرت ہوئی اس لیے کہ پرانے سکریٹری صاحب تو پانچ آنے بھی بقول اس کے نہ چھوڑتے تھے۔ بزاز کے چلے جانے کے بعد ہم نے پھر اپنے متعلق غور کرنا شروع کر دیا۔ ہم کس طرح بھاگیں یہاں سے۔ تمام حالات کا اندازہ کرنے کے بعد ہم یہ سمجھ چکے تھے۔ کہ یہاں تنخواہ تو خیر کسی کو نہیں ملتی۔ مگر یہ لوگ دوسری طرح لوٹ مار کر کے اپنا پیٹ پالتے رہتے ہیں۔ اور کسی کو تنخواہ کی زیادہ فکر بھی نہیں ہوتی۔ مگر یہ بات ہمارے بس کی نہ تھی۔ آخر ہم نے راجہ صاحب کو ایک خط لکھا جس میں صفائی کے ساتھ تمام باتیں لکھ دیں۔ کہ یہاں کا اندازہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں اور یہ ملازمت ان حالات کے تحت میرے لئے ناممکن ہے لہذا مجھے اجازت دی جائے کہ میں رخصت ہو جاؤں۔ راجہ صاحب نے اس خط کو دیکھتے ہی ہم کو طلب کیا اور ہم نے ان کے سامنے بھی تمام حالات پیش کر کے معذوری

ظاہر کردی اور صاف صاف کہدیا کہ میں دراصل اس قسم کی ملازمت کے منصب کا آدمی ہی نہیں۔ راجہ صاحب نے بجائے ہم کو مطمئن کرنے کے اور بھی اندیشہ میں مبتلا کر دیا۔ کہ صاحب یہ تو ریاستوں کی ملازمت ہے تنخواہ محض ایک بہانہ ہوتی ہے۔ ورنہ پرورش تو دوسری صورتوں سے ہوا کرتی ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ مگر میں چشم پوشی سے کام لیتا رہتا ہوں بہرحال اگر آپ اس قدر بددل ہیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کرتا۔ ہم بخیریت تمام اپنی اس ملازمت کے پہلے ہی دن واپس آگئے۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے پہلے ہی دن ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ورنہ نہیں معلوم کیا حشر ہوتا۔ اگر خدانخواستہ ہم کو پرانے سکریٹری صاحب کی طرح بننا پڑتا تو اس زندگی سے ہم موت کو ہزار درجہ بہتر سمجھتے وہ حضرت تو کسی کابجی ہاؤس کے منشی کے علاوہ اور کچھ نظر ہی نہ آتے تھے

لکھنؤ ریڈیو

اس بے کاری کے زمانہ میں ریڈیو کی وجہ سے نہایت باکار رہنا پڑتا تھا برادرم ملک حسیب احمد صاحب ڈائریکٹر آف پروگرام تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہم ہی سے گانا بھی گوانتے، وہ تو یہ کہئے کہ خیریت یہ گذری کہ ہم موسیقی کے سلسلہ میں نہایت جاہل نکلے۔ گانا تو درکنار راگوں کے نام سے بھی واقفیت نہ تھی۔ البتہ ڈراموں کا محکمہ اور تقریروں کا صیغہ ہماری تحریروں سے چند ہی دن میں پاٹ دیا گیا۔ تقریروں کا پہلا سلسلہ سمرقند و بخارا تھا جس میں تمام تقریریں ہم نے کیں۔ یہ تقریریں مزاحیہ تھیں اور دنیا کے اس دور کے متعلق تھیں جب

انسان راکٹ کے ذریعہ مریخ پر اسی طرح جایا کرے گا جس طرح آج کل ہوائی جہاز کے ذریعہ ہندوستان سے لندن جایا کرتا ہے۔ اور مریخ کے باشندوں سے اس طرح ربط ضبط پیدا ہوگا جس طرح آج کل دنیا کے ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک کے باشندوں سے ربط ضبط پیدا کرتے ہیں۔ یہ تقریریں گویا سیاحتِ مریخ کی ڈائری کی صورت میں تھیں۔ اس سلسلہ کے علاوہ سب سے پہلا ڈرامہ لکھنؤ ریڈیو کے لئے ہم نے لکھا۔ اس کا نام "خدا حافظ" تھا۔ اس ڈرامہ میں خود ہی ہیرو کا پارٹ بھی کیا تھا۔ اور اس کے بعد تو اس قدر ڈرامے لکھے ہیں کہ اتنی گنتی آتی ہوتی تو اس وقت ریاضی کے بہت بڑے ماہر ہوتے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ہم سے ڈراموں کا ایک سلسلہ "موتن شاہی تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام" کے نام سے لکھوایا۔ یہ ڈراموں کا سلسلہ گویا اسٹیج ڈراموں پر ایک طنز تھا کہ اسٹیج ڈراموں میں کس طرح قافیہ پیمائی ہوتی ہے۔ مثلاً اسی اسی سلسلہ کا ایک مکالمہ یاد آرہا ہے:-

"وزیر اعظم اس کو چھوڑ دو، اس کا منہ دربار کی طرف موڑ دو، میرے پہلے حکم کو میرے دوسرے حکم کے پتھر سے توڑ دو"

جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں اسٹیج کے اس طنز کا تھوڑا سا نمونہ یہاں بھی پیش کر دیا جائے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ایک تماشا نام ملاحظہ ہو "دمشق کی بیٹی" "عرف" "زہر شبنم"، اسی ڈرامہ کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔

ایک سہیلی — لو اور سنو۔ شہزادی گلنار ادر غم
دوسری — لے نوج دُور پار۔ شہزادی کے دشمنوں کو الم

پہلی بھولی بھالی ہیں، خوشی کو بھی غم کہتی ہیں۔

دوسری گل کی خوشبو کو بھی یہ ناک ہیں، دم کہتی ہیں۔

گلنار تم کو نہیں معلوم ــــ

آٹھوں پہر کی فکر مجھے اب عذاب ہے، جنجال والدین کو میرا شباب ہے

ایک سہیلی شاہزادی کا شباب اور والدین کو جنجال ہے

دوسری عجیب و غریب خیال ہے

شاہزادی تمہارا سمجھنا محال ہے۔ ہر وقت ان کو میری فکر شادی ہے، سمجھ لو کہ ختم میری آزادی ہے۔

ایک سہیلی آہا ہا .... شادی

دوسری مبارک، مبارک ذکرِ خانہ آبادی

پہلی اس خوشی میں آؤ گائیں۔

دوسری دونوں ایک دوسرے سے آواز ملائیں۔

گلنار کیوں مجھ دل جلی کو جلاتی ہو۔

پہلی تم بھی تو باتیں بناتی ہو۔ دل کی خوشی کو ہم سے چھپاتی ہو

دوسری شادی ہونے والی ہے نا اتراتی ہیں۔ اور اس قدر خوش ہیں کہ خوشی کو غم بتاتی ہیں۔

پہلی جیسے ہم ان کا دولہا چھین ہی تو لیں گے۔

دوسری جی ہاں، جیسے ہم سن پائے تو رو دیں گے۔

شہزادی نہیں، رونا تو میری قسمت میں لکھا ہے۔ آہ تم کو نہیں معلوم کہ

جس پتھر سے میری قسمت پھوڑی جا رہی ہے۔ وہ سہراب ہے
اب تم بھی کہو گی۔ میری قسمت خراب ہے۔

پہلی اے تو سہراب میں کون سی برائی ہے۔

دوسری وہ سپہ سالار ہے کیا کوئی ڈھولی ہے، بھشتی ہے نائی ہے؟

پہلی وہ بھی تمہاری طرح ہے۔ مورت شباب کی

دوسری پسلی پھڑکی اٹھی نظر انتخاب کی

شاہزادی میرے دکھے ہوئے دل کو نہ دکھاؤ۔ دیکھو میں رو دونگی مجھ کو نہ ستاؤ

پہلی اچھا تو تمہارے سامنے سہراب کی باتیں کریں۔

دوسری نہیں نہیں تم خود ان کا ذکر کرو۔ ہم سرد آہیں بھریں

شاہزادی آہ تم کو نہیں معلوم کہ یہ شادی میری موت کا پیغام ہے اور سہراب میری موت کا دوسرا نام ہے۔

ایک سہیلی شادی کا ذکر اور یہ بدفال

دوسری دور پار دشمن کا یہ حال

پہلی آؤ ان کا دل بہلائیں

دوسری چھوڑو، اس ذکر کو آؤ گانا گائیں

گانا

تیرے گلشن میں کیسی بہار رہے
گل تو گل ہے۔ کلی پر نکھار رہے
تیرے گلشن میں کیسی بہار رہے

یہ ہوا مست مست   یہ فضا مست مست
ہر ادا مست مست   بخدا مست مست

تو ہے مست اور سب کو خمار ہے
تیرے گلشن میں کیسی بہار ہے

کیسا رنگین گلاب   جیسے جام شراب
جیسے مست شباب   آپ اپنا جواب

تیرے رخ پر گردہ نثار ہے
تیرے گلشن میں کیسی بہار ہے

[شہزادی گاتی ہے]

میرا دل ہے اداس   یہ ہوا کب کا راس
نہیں جینے کی آس   ہر طرف جیسے یاس

گل کا ہنسنا بھی اب ناگوار ہے
میرے گلشن میں کیسی بہار ہے

[گانا ختم ہوتے ہی ایک سہیلی چیختی ہے]

ایک سہیلی اوئی یہ کون ہے اس باغ میں

دوسری لو کیڑا رینگا اس کے دماغ میں

پہلی نہیں وہ دیکھو جھاڑی میں ایک سفید پوش۔

دوسری غالباً خرگوش۔

شاہزادی نہیں نہیں کوئی انسان ہے۔

دوسری مگر یہاں کیوں آیا سخت نادان ہے

پہلی سہیلی انسان کی شکل کا کوئی حیوان ہے۔

اجنبی (اپنی جگہ پر) آہ! یہ حسن یہ جوانی میری چلتی پھرتی مرگ ناگہانی

شاہزادی (چپکے سے) الٰہی یہ انسان ہے یا حسن کا فرشتہ (زور سے) چمیلی تم جاکر
سوسن تم بھی اس سے پوچھ آؤ کہ کون ہے۔ اور کیا چاہتا ہے

اجنبی (اپنی جگہ پر) یہ کون ہے سراپا نور، میرے دل کی لگی ہوئی آگ کا
انگارہ۔ یہ عورت ہے یا آسمان کا تارہ؟

ایک سہیلی (قریب جاکر) اے شخص تیرا یہاں کیا کام ہے؟

دوسری تو کون ہے۔ تیرا کیا نام ہے۔

اجنبی میں مجنوں ہوں، مجھے لیلےٰ کا سب دیوانہ کہتے ہیں
زمانہ بھر کے اہل دل مرا افسانہ کہتے ہیں

ایک سہیلی (ہنس کر) آہاہا۔ آپ مجنوں ہیں

دوسری تو اپنی لیلےٰ کے پاس جاؤ یہاں کیوں آئے

اجنبی جہاں پر شمع جلتی ہے وہیں پروانہ آتا ہے

ایک سہیلی یہ ویرانہ نہیں ہے جس جگہ دیوانہ آتا ہے

دوسری تو آپ عاشق زار ہیں

پہلی گویا اپنے دل کے چلتے پھرتے مزار ہیں۔

دوسری معلوم ہوتا ہے کوئی دیوانہ ہے

پہلی نہیں نہیں یہ بنا ہوا فرزانہ ہے

دوسری تو پھر یہ چور ہے

شاہزادی (آجاتی ہے) یہ کیسا شور ہے کیوں بے چارے کو تنگ کرتی ہو؟ ہٹو جاؤ۔

[سہیلیاں چلی جاتی ہیں]

شاہزادی اے شخص تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔

اجنبی صرف ایک نگاہ

شاہزادی تیرا مطلب

اجنبی چاہ

شاہزادی واہ واہ تمہارا کیا مشغلہ ہے

اجنبی کبھی آہ وزاری، کبھی اشکباری، کبھی دل فگاری، کبھی بے قراری

شاہزادی مگر تم نے یہ نہیں بتایا تم کون ہو۔

اجنبی شاہ دمشق کا یکے از سپاہ

شاہزادی مگر میاں سپاہی تم کو الفت اور چاہ سے کام

اجنبی سپہ گری میرا پیشہ اور محبت میرا جنونِ خام

شاہزادی سپاہی ہوتے ہوئے بھی تم چور ہو۔

اجنبی اور چوری کرنے کے بعد تم بھی بڑی دیدہ دلیر ہو

شاہزادی میں نے چوری کی؟

اجنبی بیشک ابھی اسی وقت،

شاہزادی وہ کیسے

اجنبی یہ شمع سے پوچھو جو پروانہ کا دل چراتی ہے۔ یہ اس کلی سے پوچھو جو بلبل کو دیوانہ بناتی ہے۔ اور یہ بھی اس نظر سے پوچھو جو تمہارا دل چرانے کی چغلی کھاتی ہے۔

شہزادی۔ ایسی باتیں نہ کرو مجھ کو شرم آتی ہے

اس طنز میں قافیہ پیمائی کی زبردستیاں تو مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو جائیں گی مگر اداکاری کی بوالعجبیاں ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ عورتوں کا پارٹ کس طرح مرد کرتے تھے۔ اور پارٹ کرنے والوں کو پرامپٹر کس طرح یاد دلاتا تھا۔ ایکٹر اس کے باوجود کس طرح بھولتے تھے، وغیرہ یہ خاکہ ان ریڈیو ڈراموں میں پیش کیا تھا۔ اور یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس سے پہلے سلسلہ کے چھ ڈراموں کے بعد ہم کو دوسرا اور پھر تیسرا سلسلہ بھی لکھنا پڑا۔ ہمارا نام منشی جھومک لال ڈرامہ نگار تھا اور اس تمثیل کے نامی گرامی ایکٹروں میں ملک حسیب احمد اور مسٹر غلام قادر مسٹر ہنسراج لوتھرا اور میاں لطیف الرحمٰن یہ سب ہی شامل تھے۔ اس سلسلے میں خود اسٹیشن ڈائریکٹر یعنی جگل کشور صاحب مہرا ایسی گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ گویا آپ ہی "مالک کمپنی ہذا" ہیں

تنخواہ کی کیا ضرورت ہے

ریڈیو کے اس کام سے اس قدر آمدنی ہونے لگی کہ ہم نے خود بھی یہی سوچا کہ آخر تنخواہ کی کیا ضرورت ہے۔ اور دوسرے کی غلامی کرنے سے کیا فائدہ مگر ہم کو یہ نہ معلوم تھا کہ یہی روشنی طبع ہمارے لئے بلا بننے والی ہے، چنانچہ ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے غالباً یہ اندازہ کیا ہوگا کہ اس طرح تو یہ شخص بہت روپیہ گھسیٹ لے جائے گا۔ کیوں نہ اس

کو خود ہی گھسیٹ لیا جائے۔ چنانچہ ایک دن جگل کشور صاحب مہرا نے ہم سے کہا کہ تم ریڈیو میں آخر باقاعدہ طور پر کیوں نہیں آجاتے۔ ہم کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ لہذا ہم نے صرف یہی جواب دے دیا کہ آخر آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے جہاں چاہے بھیج دیجئے۔ اور جو چاہے کیجئے۔

ریڈیو کی ملازمت

اس گفتگو کے چند ہی دن بعد ایک روز جگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا چلو۔ ریڈیو اسٹیشن، یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ روز ہی وہ اس طرح گرفتار کر لیا کرتے تھے۔ اور ان کا موٹر اس کثرت سے ہمارے یہاں نظر آتا تھا کہ بچے تک اس موٹر کو ہمارا موٹر کہنے لگے تھے۔ مگر آج جگل صاحب نے کہا یوں نہیں بلکہ باقاعدہ طور پر چلو ہم نے پوچھا خیریت؟ جواب ملا کہ ریڈیو میں ملازمت کا حکم آگیا ہے اور تم آج سے اپنے کام کا چارج لے سکتے ہو۔ یوں ہر روز ریڈیو ہی میں وقت گذرا کرتا تھا۔ اور اب تو گویا پابندی تھی۔ جو تفریح تھی وہ روزی بن گئی۔ اخبار نویسی کی زندگی کو یہیں سے خیر باد کہا۔ اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتدا گا بجا کر شروع کر دی۔

ختم شد